پادری کو دوبارہ ہذیان

مصنفہ

پروفیسر غلام نبی مسلم۔ ایم۔ اے

www.only1or3.com
www.onlyoneorthree.com

اسلامی مشن سنت نگر۔ لاہور

طباعت : سید سنز پبلشرز و ناشر
اردو بازار۔ لاہور

اشاعت :۔ اسلامی مشن سنت نگر۔ لاہور

کتابت :۔ عبدالمجید امجد

پادری کو دوبارہ ہذیان

پادری برکت اے خاں کے ایک استفسار کے جواب میں اسلامی مشن لاہور کی طرف سے ایک رسالہ بعنوان "زندہ جاوید قرآن اور ایک پادری کا ہذیان" شائع کیا گیا ہے۔ جسے پڑھ کر جناب ماسٹر جی نے شکایت کے انداز میں لکھا ہے:۔

"نو مولود مبلغ صاحب! . . . میں ایک سکول ٹیچر ہوں۔ مگر آپ نے مجھے بار بار پادری صاحب، پادری صاحب لکھ لکھ کر ہذیان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیا یہ ہذیان میرے لئے نہیں بلکہ آپ کے لئے بالکل راست آئے گا یا نہیں؟"

ماسٹر جی! میں دینی طور پر قرآنی حکم ادفع بالتی ھی احسن (مخالف کے حملوں کی تردید نہایت عمدہ طریق سے کیا کرو) کا پابند ہوں۔ بشرطیکہ مخالف بھی شریفانہ زبان کا قائل ہو۔ میری تحریر تو "پادری برکت اے خاں کے استفسار کا جواب" سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے ہذیان کا لفظ میری تحریر میں نہیں۔ غالباً ناشر رسالہ نے آپ کے بے ربط اکھڑے اکھڑے استفسار کے پیش نظر یہ عنوان قائم کیا ہوگا۔ اس لئے آپ بھی اسلام دشمنی میں دامن احتیاط اور معقولیت ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ جناب نے اپنے نام سے قبل پادری کے لفظ کو ناپسند فرمایا ہے۔ میرے نزدیک پادری ہونا کوئی

برائی نہیں بلکہ مسیحی دنیا میں ایک معزز منصب ہے۔ اس لئے ہم احتراماً آپ کو پادری ہی لکھ رہے ہیں۔

آمدم بر سر مطلب

اس شکوہ کے بعد پادری صاحب نے قرآن اور پیغمبر اسلامؐ سے متعلق اپنے پہلے سوالات کو پھر دُہرا دیا ہے۔ حالانکہ چونسٹھ صفحات پر پھیلے ہوئے ہمارے "زندۂ جاوید قرآن" نامی رسالہ میں ان کا مفصل جواب موجود ہے۔ غالباً اپنے نام کے ساتھ پادری کا لفظ پڑھ کر ناراضگی کی وجہ سے آپ نے باقی تحریر پڑھنے کی زحمت ہی نہیں فرمائی یا آپ اسے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں یا عمر کی طوالت کی وجہ سے جناب کی یادداشت ساتھ نہیں دے رہی۔ اس کے باوجود ہم اپنے بھائی کو مایوس نہیں کریں گے۔ مگر ان کی باتوں کا جواب دینے سے قبل ہم ان کی توجہ اصل مبحث کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہم کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اس ضمن میں ہم ماسٹر جی اور قارئین سے عرض کریں گے۔ کہ وہ ہماری اس تحریر سے پہلے "زندۂ جاوید قرآن" اور اس کے بعد انجیل کے متعلق "تازہ تحقیق انجیل" کا مطالعہ کر لیں جس میں ہم نے رسالہ "کلام حق" وائکلف سنگھ اور ماسٹر جی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

اسلامی مشن کا دعویٰ

اسلامی مشن لاہور نے اس بات کا اعلان کیا تھا۔ کہ حضرت مسیحؑ اور آپ کی قوم کی مادری زبان آرامی تھی اور آپ نے گلیل اور یہودیہ کے ہم قوم یہودیوں کے سامنے اسی زبان میں انجیل کی منادی کی۔ مگر ارامی

زبان کی انجیل آج دنیا سے ناپید ہے۔ پس جو کتاب اپنی اصل زبان میں موجود نہیں۔ اس کے تراجم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے عیسائی دوست وہ انجیل پیش کریں جو جناب مسیح نے اپنے شاگردوں کی مادری زبان آرامی میں پیش کی تھی۔

اب اس کا سیدھا حل تو اسی قدر تھا۔ کہ پادری برکت۔ اے خاں، پادری کے۔ ایل ناصر اور ان کے ہم مشرب پادری اصل ارامی انجیل کو پیش کر کے بحث کو بند کر دیتے۔ انہوں نے نہ تو حضرت مسیحؑ کے اپنے الفاظ میں تعلیم کردہ انجیل کا اتہ پتہ دیا اور نہ ہی کھل کر یہ بتایا کہ:۔

"اصل انجیل تو دنیا میں کہیں موجود ہی نہیں"

بلکہ موجودہ ایک کی بجائے چار اناجیل یونانی زبان میں موجود ہیں جن سے آگے تراجم کئے گئے ہیں۔ اور تثلیث کی طرح ایک میں تین اور چار میں ایک کا معاملہ ہے۔ اور جس طرح اقنوم ثلاثہ کی کوئی کل سیدھی نہیں، ان چاروں اناجیل میں بھی کوئی ربط نہیں اور ان کے متضاد بیانات میں حسب ضرورت رد و بدل کر لیا جاتا ہے۔

پھر ہم نے دریافت کیا کہ کیا یہ چاروں اناجیل ایک ہی شخص کی تعلیم کردہ ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ان چاروں اناجیل کی تعلیمات میں جا بجا اختلاف بلکہ تضاد کیوں ہے؟ اور تضاد اور اختلاف کی صورت میں ان میں سے کون سی ایک انجیل سچی ہے۔ اور کون کون سی تین غلط ہیں۔ اور پھر ان انجیلوں کے متنوں اور تعلیمات میں وقفے وقفے کے بعد تبدیلی کیوں ہوتی رہتی ہے؟ جیسا کہ ان ہی چند سالوں میں امریکہ سے ایک ریوائزڈ ورژن (Revised version)

سے ظاہر ہے۔ جس نے مروجہ عیسائی عقائد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔

ہم اب بھی پادری صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ:۔

جناب "کلام مجسم" نے اپنے منہ اور زبان کے وسیلے سے اپنی اور قوم کی بولی میں جو تعلیم دی وہ کن الفاظ میں تھی۔ وہ الفاظ کہاں ہیں؟ تاکہ "ایک کلام" کی موجودگی میں مسیحی دنیا کے اختلافات بھی ختم ہوجائیں۔ اور ہم بھی موجودہ اناجیل کے اختلافات سے بچ کر اصل تعلیم سے آگاہ ہوسکیں۔

پادری صاحب کی تازہ گوہر افشانی

آپ فرماتے ہیں:۔

"مسلم جی! خدا آپ کو دانائی، پاکیزگی اور شرافت بخشے۔ عرض ہے کہ غالباً قرآن مجید میں "اسلام" کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ تاہم دنیائے اسلام اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ لہٰذا قرآن مجید حضور صلعم کا قرآن نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا قرآن اور کلام ہے قرآن مجید کی عربی عبارت کی فصاحت و بلاغت کا سہرا کریڈٹ اللہ کو پہنچتا ہے۔ نہ کہ حضور صلعم کو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ فصاحت و بلاغت کا سہرا تو حضرت عثمان غنی جامع القرآن کا حق ہے۔ جس نے سابقہ نسخہ جات قرآن جو مختلف لوگوں نے لکھ رکھے تھے۔ ان کو ان لوگوں سے جبراً چھین کر ایک نیا نسخہ قرآن مجید کا تیار کرایا۔ ایک دفتر کھولا اور اس کام کے لئے ماہر عالم فاضل اصحاب یعنی زید بن ثابت عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو مقرر کیا۔ اور ہدایت کی کہ قریش کے رسم الخط پر قرآن مجید تحریر

کریں۔ اعراب لگائیں۔ نمبر رکوع اور نمبر آیات لگائیں۔ حضرت عثمانؓ نے اس موجودہ نسخہ قرآن کے علاوہ دوسرے نسخہ جات کو آگ میں جلایا یا ضائع کردیا۔ احتراقِ قرآن کے متعلق میرے اس دعویٰ کے ثبوت میں سرکار علامہ سید علی الحائری کی تحریر کردہ کتاب بنام "موعظہ حسنہ" ص ۱۳۵ تا ۱۴۶ پڑھیں"۔

پادری صاحب! میرا خیال تھا کہ "زندہ جاوید قرآن" کے ناشر وکاتب نے ہذیان کا لفظ آپ سے منسوب کرکے قدرے زیادتی کی ہے۔ لیکن آپ کی زیر نظر بہکی بہکی ژولیدہ عبارت نے میری رائے کو متزلزل کردیا ہے۔ اب آپ اپنے کسی ہم نشین کے سامنے یہ فقرات پیش کرکے اس کی رائے تو لیجئے۔ کہ آپ کی طرح غیر مربوط، متضاد اور مبہم باتیں لکھنے والا شخص فہم و فراست کے کس مقام پہ ہے؟ اور اس کی نظر میں یہ عبارت کسی مریض ذہن کی پیداوار تو نہیں؟

میرے متعلق آپ کی دعا کا شکریہ! اللہ تعالیٰ آپ کو بھی دانائی پاکیزگی و شرافت عطا کرے۔ آپ کا فقرہ کہ غالباً قرآن مجید میں "اسلام" کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ بے معنی، غیر متعلق اور مبہم ہے۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ "اسلام" کا لفظ قرآن میں نہیں تو واضح رہے کہ قرآن مجید میں

ان الدین عند اللہ الاسلام اور رضیت لکم الاسلام دینا کے الفاظ موجود ہیں۔ مگر فقرے کے سیاق و سباق سے کوئی صاف مطلب معلوم نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم اللہ کا ہی کلام ہے

آپ نے قرآن مجید کو کلام الٰہی کے طور پر پیش کرکے یہ ثابت

کرنے کی فضول کوشش کی ہے کہ اس کی فصاحت و بلاغت کا کریڈٹ خدا کو جاتا ہے۔ حضرت محمد صلعم کا اس میں کیا کمال ہے؟ کاش یہ جملہ لکھتے وقت آپ اس پر مزید غور کر لیتے۔

پادری صاحب! قرآن مجید خدا ہی کا کلام ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت بھی اسی کا احسان ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب کوئی عظیم سلطان اپنا پیغام کسی دوسرے سلطان یا قوم کی طرف بھیجتا ہے۔ تو اس پیغام پہنچانے کے لئے وہ ایسے شخص کو رسول یا پیغام رساں مقرر کرتا ہے۔ جو اس کا سب سے زیادہ معتمد ہو۔ جو اس کے کلام کے مندرجات سمجھنے کی کامل صلاحیت رکھتا ہو۔ پھر زبان کے محاسن اور فصاحت و بلاغت کا مرقع ہو۔ جو اپنی دانش زباندانی اور خطابت سے اپنے سلطان کے مکتوب کی کماحقہ تشریح و تفسیر کر سکے۔ اور حسن بیان سے علماء و فضلاء کے دل و دماغ پر چھا جائے۔ جس عظیم انسان نے قرآن مجید ایسی فصیح و بلیغ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی۔ اس کی تعلیمات پر عمل کر کے اور ان کی اشاعت کر کے حکمائے عالم کو متاثر کیا اور عرب کے خطباء، شعراء اور زبان پر فخر کرنے والے اکابر سے اپنی فصاحت و بلاغت سے افصح العرب ہونے کا خطاب پایا۔ اس کی فصاحت و بلاغت کا انکار احمقانہ جسارت ہے۔

پادری صاحب! ہوش و خرد کے ناخن لیجئے۔ جس نبی آخر الزمان ؐ نے قرآن ایسی فصیح و بلیغ کتاب اپنے فصیح و بلیغ نطق مبارک سے دنیا سے منوائی اور قرآن مجید کے پہلو بہ پہلو جس کی لسانی عظمت کو نہ صرف ہم عصروں بلکہ آج تک ہونے والے علماء زبان نے تسلیم کیا ہے۔ اس کے متعلق عربی کے محاسن سے بے بہرہ شخص زبان کھولے تو علمی دنیا اسے کیا کہے گی؟

آپ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ پہلے نبیوں پر بھی کلام الہٰی نازل ہوا۔ تو کیا وہ نبی اپنی قوم کے مقابل کلام الہٰی کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ یا ان کی قوم ان سے زیادہ فصیح و بلیغ تھی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ جس شخص کو اپنا رسول چنتا ہے اور اس پر اپنا کلام اتارتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں کلام کا سب سے زیادہ سمجھنے والا ہوتا ہے۔ اور یہ امر اسے دوسرے انسانوں میں بلند ترین مقام عطا کرتا ہے۔

البتہ انجیل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جناب مسیحؑ فصاحت و بلاغت سے عاری تھے۔ وہ اپنا کلام وضاحت سے پیش نہیں کر سکتے تھے اور اکثر اوقات عام لوگ تو در کنار خود جناب کے بارہ شاگرد بھی آپ کی بات سمجھنے سے قاصر و عاجز رہتے تھے۔ شاید اپنی بے علمی اور جہالت کی بنا پر یا جناب مسیحؑ کی غیر فصیح تقریر کی وجہ سے، چنانچہ وہ جناب مسیحؑ کی زبان سے ایک تمثیل سن کر کہنے لگے۔

"کھیت کے کڑوے دانوں کی تمثیل ہم کو سمجھا دے"

(لوقا ۹ : ۴۵)

اسی طرح ایک تمثیل سننے کے بعد سب سے بڑے شاگرد جناب پطرس نے عرض کی:۔

"یہ تمثیل ہمیں سمجھا دے" تو مسیح نے فرمایا "کیا تم بھی اب تک بے سمجھ ہو"

(متی ۱۳ : ۳۶)

مگر اس کے برعکس آنحضرت صلعم جب کسی طالب حق کے سامنے قرآن حکیم پیش کر کے زبانِ فیض ترجمان سے اس کی تشریح فرماتے۔ تو وہ سننے والا آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ کیا ہی فصیح و بلیغ کلام الہٰی! کیا ہی

فصیح و بلیغ رسولِ حق! اور کیسے ہی فصیح و بلیغ فدائیانِ اسلام تھے۔ کلامِ پاک کی فصاحت و بلاغت اپنے ان بھائی بندوں کی زبان سے سنیئے۔ جو عربی زبان کی شُد بُد رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن کی تفاسیر لکھیں اور انہیں مذہبی نفرت کے باوجود قرآن کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

۱۔ مفسّرِ قرآن جارج سیل

"قرآنِ حکیم کا اسلوب بیان عموماً حسین و سلیس ہے۔۔۔۔ اور بعض مقامات پر جہاں خاص کر اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ انداز ارفع و اعلیٰ ہے پیغمبرِ اسلام کو اس قدر نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور اس قدر حیرت انگیز طریق سے اپنے سامعین کے قلوب کو مسحور و مسخر کر لیا کہ آپ کے بہت سے مخالفوں نے اسے جادو اور سحر کا عمل قرار دیا۔"

(پر یلیمنیری ڈسکورسز ص۴۸)

۲۔ پالمر

"یہ بات بذاتِ خود حیران کن نہیں کہ آج تک بہترین عربی فصحاء قرآن کی مثال پیش کرنے سے قاصر چلے آ رہے ہیں۔"

(تعارفِ قرآن ص۱۰۷)

۳۔ جرمن فلسفی گوئٹے

"جوں جوں ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلے ہم مایوس ہوتے ہیں۔ مگر یہ کتاب جلدی ہی ہماری توجہ کو جذب کر لیتی ہے۔ پھر متحیر کرتی ہے۔ اور آخر کار ہمیں احترام پر مجبور کر دیتی ہے۔۔۔۔ مقاصد اور مضامین کے لحاظ سے اس کی طرزِ نگارش سادہ اور پُر عظمت ہے۔ مگر ہمیشہ دل کو مرعوب کرتی ہے۔ پس یہ کتاب تا ابد دلوں پر گہرا اثر ڈالتی رہے گی۔"

(ہیوجز ڈکشنری آف اسلام ص۵۲۶)

۳- ریونڈ باسورتھ سمتھ

"یہ (قرآن) واحد معجزہ ہے جس کا محمدؐ نے دعویٰ کیا۔ اس کا نام انہوں نے "دائمی معجزہ" رکھا اور درحقیقت یہ ایک معجزہ ہی ہے۔"
(محمدؐ ص ۲۹۰)

۴- ہرشس فیلڈ

"اپنی قوتِ استدلال، فصاحت اور طرزِ نگارش کے لحاظ سے قرآن کی مثال لانا ممکن نہیں ہے۔ اور مسلم دنیا میں سائنس کے مختلف شعبوں میں بے نظیر ترقی بالواسطہ اسی کا فیضان تھا۔"
(نیو ریسرچز ص ۸-۹)

حضرت عثمانؓ کا ذکر

آپ نے وضاحت کے ضمن میں حضرت عثمانؓ کا ذکر بلاوجہ کیا ہے۔ انہوں نے قرآن کو کبھی اپنا کلام نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ اسے کلام اللہ ہی کہا ہے۔ بفرضِ محال اگر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں چند عالموں نے مختلف لوگوں سے قرآن کے صفحات جمع کر کے موجودہ قرآن کو ترتیب دیا تو پھر فصاحت کا مرکز تو وہی پہلے قرآن رہے۔ جن کو یک جا کیا گیا۔ اس میں جمع کرنے والوں کا کیا کمال ہے۔ اور حضرت عثمانؓ کا تو اس نئی ترتیب میں کوئی دخل نہ تھا۔ انہوں نے صرف اس کی نقلیں باہر بھیجیں۔ قرآن کی عبارت میں تو ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ وہ تو بہرحال اللہ کا کلام رہا۔ اس لئے آپ نے فصاحتِ قرآن کا کریڈٹ

انہیں کیسے دے دیا۔ آپ ہی بتایئے کہ آپ کی اس منطق کا کیا نام رکھا جائے۔

آپ نے قرآن کے جلانے کا ذکر بلا دلیل کیا ہے۔ چودہ سو سال بعد کسی علامہ حائری کی تحریر کا حوالہ غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ جناب تنکوں کا سہارا کیوں لیتے ہیں۔ آنحضرت کے زمانے میں بہت سے لوگوں کے پاس قرآن تحریری صورت میں موجود تھا۔ آنحضرت صلعم سمیت ہزاروں مسلمانوں کو یہ قرآن زبانی یاد تھا۔ لوگ اسے پانچ وقت صلوٰۃ اور تہجد میں پڑھتے تھے۔ جناب نے گذشتہ مکتوب میں خود لکھا ہے۔ کہ جنگِ یمامہ میں جو عہدِ ابوبکر صدیق میں آنحضرتؐ کے وصال کے صرف پانچ ماہ بعد ہوئی تھی۔ ہزاروں حافظانِ قرآن شہید ہو گئے تھے اور یقیناً ہزاروں بچ بھی گئے ہوں گے۔ کیونکہ نہ سارے مسلمان وہاں شہید ہو گئے تھے۔ اور نہ ہی سب حفاظ اس جنگ میں شریک تھے۔ پھر مدینہ منورہ، خانہ کعبہ اور عالمِ اسلام کی دیگر مساجد میں قرآن حکیم کا درس جاری تھا۔ اور آنحضرتؐ کے وصال کے اڑھائی سال بعد عہدِ فاروقی میں اسلامی دنیا کی تمام مساجد میں حافظانِ قرآن کے ذریعے سے صلوٰۃ تراویح میں قرآن سنایا جانے لگا تھا۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس صورت میں کسی دوسرے قرآن کی گنجائش کہاں تھی۔ کہ نیا قرآن لکھ کر پہلوں کو جلا دیا جاتا۔ اور یہ بات خلافِ قیاس وعقل ہے کہ مراکش سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا کے ایک ایک گھر سے قرآن جمع کر کے جلا دیئے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے نومسلموں اور نئے ملکوں کی ضرورت کے پیشِ نظر سرکاری انتظام کے ماتحت

قرآن حکیم کی بہت سی نقلیں تیار کروائیں اور انہیں مختلف ملکوں میں بھجوادیا تاکہ لوگ ان کی مدد سے نئی جلدیں تیار کریں۔ ورنہ نیا قرآن تیار کرانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس عام فہم بات کو غلط رنگ دینا دیانت نہیں۔ اور جلانے کی روایت لغو اور دشمنوں کی کارروائی ہے۔ اگر آپ کو سید علی حائری کی بات پر یقین ہے۔ تو پھر سید علی حائری کے بھائی بندوں سے ایک ہی ایسا قرآن لے آئیں جو موجودہ مروجہ قرآن سے مختلف ہو۔ یا ان کی ذاتی لائبریری سے قرآن نکال کر دیکھ لیں کہ کون سا ہے؟ اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر تھوڑی سی شرم بھی کافی ہوگی۔ مگر آپ یہ بتائیے کہ ان بیسیوں انجیلوں کا کیا حشر ہوا۔ جن میں سے چوتھی صدی عیسوی میں موجودہ چار اناجیل چھانٹی گئیں۔ کیا انہیں ایک خاص مسلک کے پادریوں نے شاہی قوت کے بل بوتے پر آگ کی نذر کیا تھا۔ یا کسی اور طریق سے تلف کر دیا تھا۔ کچھ اپنے متعلق بھی تو بتائیے۔

اعراب و رکوع

آپ کے کان میں کس نے کہہ دیا کہ حضرت عثمان غنیؓ نے اعراب وغیرہ لگوائے۔ اس وقت تو اس کی ضرورت کم ہی محسوس ہوئی۔ اعراب اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں لگائے گئے۔ تاکہ غیر عرب لوگ قرآن کو درست طور پر پڑھ، لکھ اور سمجھ سکیں۔ کیونکہ عربی زبان میں زیر، زبر، پیش اور اعراب کی صحیح ادائیگی کے بغیر معنوں میں عظیم فرق آجاتا ہے۔ عرب تو اس اونچ نیچ سے

واقف تھے۔ اس لئے غیر عربوں کی سہولت کے لئے اموی دور میں اعراب لگائے گئے۔ جسے دنیائے اسلام نے اختیار کیا۔ اور آج تک ان کی صحت اور حفاظت کا اہتمام کیا ہے۔ جس کی وجہ سے قرآن وعدہ الہٰی کے مطابق ہر قسم کی تحریف اور اغلاط سے محفوظ رہا ہے۔

جہالت کا ایک اور مظاہرہ :-

ایک کم علم شخص کی جہالت اس وقت آشکار ہوتی ہے۔ جب وہ کسی ایسے موضوع پر لب کشائی کرتا ہے۔ جو اس کی عقل و رائے سے بالاتر ہو۔ چنانچہ ماسٹر جی لکھتے ہیں :-

" اگر کسی کتاب میں زباندانی کی لفاظی میں فصاحت و بلاغت تو موجود ہو۔ لیکن اگر اس میں بلحاظ معنی و مفہوم حقیقت و معرفت کی فصاحت و بلاغت کی سربلندی اور پاکیزگی موجود نہ ہو تو کیا فائدہ ؟ قرآن مجید کی عربی پرانی اور محاورات قریباً متروک ہو چکے ہیں۔ نئی عربی اب رائج الوقت ہے۔"

جناب پادری صاحب! اگر آپ کو فصاحت و بلاغت اور متروک الفاظ کا مفہوم معلوم نہیں تو بیان اور لغت کی کوئی کتاب دیکھتے یا اپنے کسی پڑھے لکھے دوست سے دریافت کر لیتے۔ یہ آپ کو کس نے بتایا کہ ایسا کلام بھی فصیح و بلیغ کہلاتا ہے۔ "جس میں بلحاظ معنی و مفہوم حقیقت و معرفت کی فصاحت و بلاغت کی سربلندی اور پاکیزگی موجود نہ ہو۔"

فصیح و بلیغ کلام وہ نہیں ہوتا۔ کہ اس میں اچھے اچھے الفاظ کی بھر مار ہو۔ مگر حسنِ معانی سے عاری ہو۔ فصاحت دل نشین پیرایہ میں مطلب واضح کرنے کا نام ہے۔ اور بلاغت حسین اسلوبِ ادا ئیگی سے مفہوم و معانی کے دل میں اُتر جانے کو کہتے ہیں۔

فصیح و بلیغ کلام میں ضروری ہے۔ کہ اعلیٰ اور حسین خیالات کے اظہار کے لئے ایسے موزوں الفاظ اور طرزِ بیان اختیار کیا جائے کہ اس کے سننے یا پڑھنے ہی کلام کا مطلب سامع کے دل میں اُتر جائے۔ اہلِ علم نے عمدہ کلام کے متعلق کہا ہے۔ کہ خیرُ الکلامِ ما قَلَّ وَ دَلَّ۔ عمدہ کلام وہ ہے۔ جس کے الفاظ تھوڑے ہوں۔ مگر دلائل سے پُر ہو۔ یہ نہیں کہ موٹے موٹے الفاظ کو اس طریق سے جمع کر دیا جائے۔ کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑے۔ جیسا کہ انجیل کی بعض تمثیلیں ہیں۔ کہ عوام تو درکنار خاص شاگردانِ مسیح بھی نہ سمجھ سکے۔

قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت یہی ہے کہ اس میں بلند اور اعلیٰ خیالات کو انتہائی خوب صورتی اور اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار نے قرآن کو اپنے اثر کے لحاظ سے سحر قرار دیا۔ جس شخص نے کلام سنا وہ گرویدہ ہو گیا۔ حضرت عمرؓ آپ کے قتل کی نیت سے نکلے۔ لیکن قرآن پاک سن کر فدائی بن گئے۔ طفیل بن عمرو دوسی قریشی کے کہنے پر کانوں میں روئی ڈالے پھرتے تاکہ قرآن کے الفاظ کا جادو ان پہ اثر نہ کر جائے۔ آخر ایک دن آنحضرتؐ کو قرآن پاک پڑھتے سنا۔ تو اس کی عظمت کی گواہی دی۔

ولید بن عتبہ آپ کو سمجھانے آیا ۔ مگر قرآن سن کر مبہوت ہو گیا ، اور کچھ کہے بغیر چلا گیا ۔ کیا یہ واقعات اس بات کا ثبوت نہیں ۔ کہ قرآن کا حسن اس کی لسانی اور معنوی خوبیوں کی بنا پر ہے ۔ اور اس کی شہادت میں ہم جناب پالمر، جارج سیل ، گوئٹے اور ہرش فیلڈ کی شہادت پیش کر چکے ہیں ۔

آپ نے قرآن کی زبان کو متروک کہا ہے ۔ آپ کی یہ ذہنی کیفیت قرآن دشمنی کا نتیجہ ہے ۔ میاں لال بجھکڑ کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی ۔ آپ بتائیے ۔ کہ قرآن کا کون سا محاورہ یا لفظ اب متروک ہو چکا ہے ۔ اور عالم عرب کی گفتگو یا تحریر میں مستعمل نہیں ۔ جو کتاب دنیا بھر اور بالخصوص عالم عرب میں شب و روز پڑھی جاتی ہے ۔ جس کی تعلیم کے لئے یونیورسٹیاں ، کالج اور ہزاروں دینی مدارس دنیائے اسلام میں روز اول ہی سے کھلے ہوئے ہیں ۔ جس کی تفسیریں شب و روز ہوتی رہتی ہیں ۔ جس کی لغات آئے دن چھپتی اور پڑھی جاتی ہے ۔ جس کی اساس پر مسلمان علماء ہی نہیں غیر مسلم بھی کتابیں ، رسالے اور مضامین شائع کرتے ہیں ۔ اور جس کی تعلیمات اور فقرات کم و بیش ہر مسلم کی زبان پر رہتے ہیں ۔ اس کے الفاظ متروک کیسے ہو سکتے ہیں ؟ پھر زبان میں نئے الفاظ کا اضافہ اس بات کی دلیل نہیں کہ پہلے الفاظ ترک کر دیئے گئے ہیں ۔ اضافہ تو مروجہ الفاظ کی افادیت میں اضافہ کرتا ہے پس قرآن مجید کی عربی کو پرانی اور محاورات کو متروک کہنا اپنی جہالت کا اعلان کرنا ہے ۔ اور دنیا بھر میں کوئی جاہل ہی ایسی جسارت کر سکتا ہے ۔

مسلمانوں کو قرآن کی زبان سے عشق ہے ۔ وہ اسے استعمال میں رکھنا جزو ایمان جانتے ہیں ۔ اس لئے وہ قرآنی الفاظ اور محاورات کو ترک کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتے ۔ اور ماسٹر صاحب کا مفروضہ ایک وہم اور خدا دشمنی کے

سوا کچھ نہیں۔

البتہ انجیل کی آرامی زبان اور محاورات نہ صرف پرانے اور متروک ہیں۔ بلکہ ایسی زبان کو مردہ کہتے ہیں جو نہ پڑھی جاتی ہے نہ لکھی جاتی ہے۔ اور نہ کہیں بولی جاتی ہے۔ اور یہ امر مسیحی دنیا کی اپنی مذہبی کتاب اور زبان سے بے حسی کی علامت ہے، جو افسوس ناک بلکہ شرمناک ہے۔

شاگرد اور روح القدس

پادری صاحب قرآن کے مقابل شاگردانِ مسیح پر روح القدس کے نزول کا ذکر فرماتے ہیں۔ کہ مسیح کے صعود (اٹھائے جانے) کے دس دن بعد شاگردوں پر روح القدس نازل ہوا اور ان کو غیر زبانیں بولنے اور غیر زبانوں میں انجیل مقدس کی منادی گواہی اور تحریر و تقریر کی قوت ملی۔ بعد ازاں ان رسولوں نے روح القدس کی تحریک سے اس زمانہ کی یونانی عالم گیر زبان میں انجیل مقدس کو قلم بند کیا۔"

ان سطور پر غور کیجئے جو جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ یہ ایسے دعوے ہیں جن کی صحت اور تائید میں کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی۔ آپ بتائیے، کہ روح القدس کے نزول کے بعد کیا شاگرد اپنی مادری اور دینی آرامی زبان بھول گئے، کیونکہ مسیحی تاریخ میں ہمیں کوئی ایسی تحریر نہیں ملتی، جو کسی شاگرد نے اپنی زبان میں چھوڑی ہو۔ اور روح القدس کی تائید سے مسیحی تاریخ نے اسے محفوظ رکھا ہو۔ نیز اگر شاگرد مختلف زبانیں بولنے لگے تھے۔ تو کیا آپ ان زبانوں کی تفصیل دے سکتے ہیں۔ اور ان زبانوں میں انہوں نے کون سی کونسی تحریریں چھوڑیں؟ اس کے علاوہ ہمیں شاگردوں کے جو مکتوبات عہد نامہ جدید میں

ملتے ہیں۔ وہ کن غیر ارامی زبانوں میں کون کونسی اقوام کو لکھے گئے تھے؟ پھر جناب نے دعویٰ کیا ہے۔ کہ ان رسولوں نے یونانی زبان میں انجیل مقدس کو قلم بند کیا۔ اگر یہ درست ہے۔ تو خود جناب مسیحؑ کی یہودی قوم کے لئے جس کی زبان محض آرامی تھی۔ انجیل کیوں نہ لکھی گئی۔ اور وہ کیوں اپنی واحد زبان آرامی میں انجیل سے محروم کر دیئے گئے۔ کیا روح القدس آرامی زبان سے بے بہرہ تھا۔ اگر اس زبان کی ضرورت نہ تھی۔ تو پھر جناب مسیحؑ نے خود یونانی زبان کو ذریعہ اظہار کیوں نہ بنایا؟۔

آپ کا یہ دعوےٰ بھی بے بنیاد ہے۔ کہ ان رسولوں نے یونانی زبان میں انجیل لکھی۔ کیا آپ اس دعوے کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے لکھنے والے مرقس، متی، لوقا اور یوحنا نہ روح القدس سے زبانیں سیکھنے والے بارہ شاگردوں میں شامل تھے۔ نہ انہوں نے جناب مسیحؑ کی صحبت پائی تھی۔ بلکہ یہ بعد کے لوگ تھے۔ جنہوں نے ۶۵ سنہء سے ۱۲۰ سنہء کے درمیانی عرصے میں اِدھر اُدھر سے واقعات جمع کر کے اناجیل مرتب کیں۔ وہ ارامی زبان کے مقابل یونانی سے زیادہ شناسا تھے۔ اور چونکہ براہ راست انجیل کا علم نہ رکھتے تھے۔ اور ان میں حق و باطل، غلط اور صحیح میں امتیاز کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لئے ان کے بیانات اور تعلیمات میں اختلاف بلکہ تضاد ملتا ہے۔ جن کی موجودگی میں موجودہ اناجیل کی صحت مجروح ہو گئی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ ان حقائق کی موجودگی میں ماسٹر صاحب اپنے غلط اور ناقابلِ فہم موقف کو ترک کیوں نہیں کرتے۔ اہلِ دانش تو ضد نہیں کیا کرتے۔

آسمانی کتاب کا مفہوم

پادری برکت اے۔ خان فرماتے ہیں:۔

"مسلم جی! خدا آپ کا بھلا کرے۔ میری نصیحت کو عمر بھر نہ بھولیں۔ کہ الہامی کتابیں مسیحی عقیدہ کے مطابق ہرگز آسمان پر نہ لکھ رکھی تھیں۔ کیونکہ آسمان پر خدا کے پاس کوئی کاغذ کا کارخانہ اور پریس موجود نہیں۔ مسیح خداوند پر کوئی انجیل آسمان سے نازل نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ مسیح خداوند بذاتِ خود کلمۃ اللہ مجسم کلام اللہ یعنی مجسم کتاب اور مجسم انجیل تھے۔ جو آسمان سے نازل ہوئے تھے۔"

پادری برکت صاحب! آپ کی نصیحت کا شکریہ! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، مگر آپ کتاب استثنا (۵ : ۲۲) کی یہ عبارت پڑھیئے۔

"یہی باتیں (دس احکام توریت) خداوند نے اس پہاڑ پر آگ اور گھٹا اور ظلمت میں سے تمہاری ساری جماعت کو بلند آواز سے کہیں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہا اور ان ہی کو اس نے پتھر کی دو لوحوں پر لکھا اور ان کو میرے سپرد کیا۔"

حضرت موسیٰ کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ خدا نے پتھر کی دو تختیوں پر اپنے ہاتھ سے دس احکام لکھ کر ان کے سپرد کیئے۔

بلاشبہ خدا کے پاس آسمان پر کاغذ کا کارخانہ اور پریس نہیں مگر آپ کے

عقیدے کے مطابق اس کے پاس قلم دوات اور تختیاں ضرور تھیں۔ اگر خدا ان اشیا کا محتاج تھا۔ تو پھر کاغذ کی موجودگی پر کیا اعتراض ہے؟

میرے بھائی! اللہ تعالیٰ کی ذات کسی شے کی محتاج نہیں اور نہ ہی اس نے کاغذ پہ کوئی کتاب لکھ رکھی تھی۔ مگر اللہ تعالےٰ بعض باتیں بندوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے ان اصطلاحات اور اشیاء کا ذکر کرتا ہے۔ جو انسانی ذہن، علم اور مشاہدے کے قریب اور آسان فہم ہوتی ہیں۔ یہ طریق تمام آسمانی تعلیمات میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انجیل میں بھی جس قدر تماثیل ہیں وہ اپنے ظاہری معنوں میں نہیں۔ تاکستان، کھیت مالک وغیرہ کے کردار کو سمجھنے کے لئے ان کو ظاہر سے الگ کر کے معنوی مفہوم ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ جناب مسیحؑ نے خود ان کی تشریح کر کے واضح کیا۔ اور لغوی معنی لئے جاتے تو پھر تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہ پڑتی۔

آپ کو قدرتِ خداوندی اور قرآن میں لفظِ کتابت سے لاعلمی کی بنا پر کتاب سے متعلق دھوکا لگا۔ قرآن میں کتاب کا لفظ قانون حکمِ الٰہی، فرض وغیرہ کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً

انّ الصّلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً ؁

صلوٰۃ کی مقررہ اوقات میں ادائیگی ایک فریضہ ہے۔ کتب اللہ علی نفسہ الرحمۃ۔ اللہ نے رحمت کو اپنے لئے لکھ لیا۔ (لازم ٹھہرا لیا) ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق، فطرت اور اس کے

ارتقائی تقاضوں کا علم رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے علم میں وہ تمام قوانین و اصول ہیں۔ جو انسانی ذات کی کامل نشوو نما کے لئے اٹل ہیں۔ علم خداوندی میں اسی "مکمل ضابطہ حیات" کا نام الکتاب ہے۔ جو علم اور تقدیر الہٰی میں ایک مکمل اکائی ہے۔ اور جسے عام انسان غور و تدبر کی کمی کے باعث نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ جناب مسیحؑ کے کلام کو اکثر آپ کے خاص شاگرد بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔ مگر یہ کلام کی خامی نہ تھی۔ پھر جن لوگوں کو حقیقی خدا، اس کی تعلیمات، انبیاء اور اہل اللہ کی سیرت کا علم نہیں۔ وہ آسمانی کلام کی روح تمثیلات اور انداز بیان کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔

اسی ناسمجھی کا مظاہرہ جناب نے نزول انجیل کے ضمن میں کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "مسیح خداوند مجسم کلمۃ اللہ، مجسم کلام اللہ یعنی مجسم کتاب اور مجسم انجیل تھے"

اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کتاب ہونے کے ناطے سے آپ کاغذ کے بنے ہوئے تھے۔ اور آپ کسی پریس میں چھپے ہوئے تھے یا اللہ کا کلمہ اور کلام ہونے کی وجہ سے آپ کا مادی وجود ہی نہ تھا۔ کیونکہ کلمہ یا کلام کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ کلمہ ایک عورت کے رحم میں خون پہ پلتا رہا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں، اعصاب، خون فضلہ۔ پیشاب سب کلمۃ اللہ اور کتاب تھے۔ اور یہ مجسم کلام کسی لمبی سیڑھی کے ذریعے کسی آسمان سے زمین پہ اتارا گیا۔ دراصل مسیحؑ کا کلمۃ اللہ ہونا ایک حسین استعارہ ہے کہ احکام الہٰی کا پابند اور فنا فی اللہ ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشات سے بلند ہو کر کلام بن گئے تھے۔ اسی کی طرف اشارہ "رانجھا رانجھا

آکھدی ہیں آپ ؎ رانجھا ہوئی" کے جملہ میں ملتا ہے ۔ اور حضرت مسیحؑ کی اکثر باتیں استعارہ اور مجاز کے رنگ میں تھیں ۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ " راہ حق اور زندگی میں ہوں" (یوحنا ۱۴ : ۶)

یسوع نے اس سے کہا "قیامت اور زندگی تو میں ہوں"

(یوحنا ۱۱ : ۲۵)

" جو باتیں میں نے تم سے کہی ہیں ۔ وہ روح ہیں اور زندگی بھی ہیں"

(یوحنا ۶ : ۶۳)

" میں ہوں وہ زندگی کی روٹی جو آسمان سے اُتری "

(یوحنا ۶ : ۵۱)

" جو میرا گوشت کھاتا اور میرا خون پیتا ہے وہ مجھ میں قائم رہتا ہے"

(یوحنا ۶ : ۵۶)

ان آیات میں حضرت مسیحؑ کا راہ ، زندگی ، حق ، قیامت ، زندگی کی روٹی ، گوشت ، خون اسی طرح استعارہ اور مجاز ہیں ۔ جیسے کلمۃ اللہ اور مجسم کلام ہونا ۔ ان الفاظ کا ظاہری لغوی مفہوم لینا نادانی اور روحانی دنیا سے بے خبری ہے ۔ اس لئے عاقبت سنوارنے کے لئے خلوص نیت سے پڑھئے اور دیکھیئے ۔

ایک اور طفلانہ استدلال

پادری برکت اے خاں صاحب کے دل میں اسلام کے خلاف جو بغض بھرا ہوا ہے (موتوا بغیظکم

اس کے زیر اثر آپ جن خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان سے جناب کی بے علمی، تاریخ سے عدم واقفیت اور دینی کتب کے طرز استدلال سے بے خبری عیاں ہے۔ ہم اُن کے اپنے الفاظ کو اس لئے درج کر رہے ہیں۔ کہ قارئین کو ان کے خیالات کا اندازہ ہو سکے۔ اور خود ہادی صاحب اپنے دلائل کے آئینے میں اپنا حقیقی چہرہ دیکھ سکیں۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

"توریت شریف کی کتاب جسے بزرگ موسیٰؑ نے قلم بند کیا تھا۔ اس میں کوئی ذکر نہیں کہ بزرگ ابراہیم اپنے فرزند اسمٰعیل کے ہمراہ مکہ شریف میں گئے تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا۔ یہ بزرگ ابراہیمؑ کی نسل کی توہین ہے۔ کہ خانہ کعبہ میں نسل ابراہیم ۳۶۰ بتوں کی پوجا میں گر گئی تھی۔ اور وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے۔ کم سن چھ چھ سال کی بچیوں سے شادی کرتے تھے۔ اور بکثرت غیر منکوحہ لونڈیاں رکھتے تھے۔ حضور صلعم کی وجہ سے عرب میں اخلاقی عروج کو سوا دینے کے لئے آل ابراہیمؑ کے اخلاقی زوال کی کہانی ناقابل تسلیم ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ بزرگ ابراہیمؑ کے بیٹے اسحاق کی نسل کو نبوت، حکومت اور اتنی فضیلت بخشی۔ لیکن نسل حضرت اسمٰعیلؑ کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور وہ جہالت کی تاریکیوں میں گم ہو گئی"

قرآن مجید نے ایک اصول پیش کیا ہے۔ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ افلا تعقلون "جس کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں۔ اس کی تخلیق کو الٹ دیتے ہیں۔ کیا تم غور نہیں کرتے" انسان جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ اس کے قوائے جسمانی اور ذہنی ضعیف ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی مت ماری جاتی ہے حافظہ اور فکر کی استعداد زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر اس کے عزیز بھی اسے معذور سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمیں ماسٹر صاحب کی ذہنی کیفیت پر ترس آنے لگا ہے۔ تاہم ان کی تسلی اور قارئین کی رہنمائی کے لئے ان کے افکار کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اہل علم جانتے ہیں کہ کتاب مقدس یعنی بائبل کی ابتدائی پانچ کتابیں حضرت موسیٰ کی تحریر کردہ بیان کی جاتی ہیں۔ مگر موسیٰ کی پانچویں کتاب استثناء ہی میں لکھا ہے:۔

"پس خدا کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہنے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل دفن کیا۔ پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا" (۳۴: ۵-۷)

اگر یہ کتاب موسیٰ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ تو کیا انہوں نے اپنی موت کی خبر قبر میں سے لکھ بھیجی تھی۔ پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں، کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں، کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ کے بہت بعد لکھی گئی، کہ آپ کی قبر کا نشان بھی نہ رہا تھا۔ اور تاریخ دان جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے ایک ہزار سال بعد بابل کے بادشاہ بنوکدنصر

(بخت نصر) نے ہیکل کو تباہ کیا اور بنی اسرائیل کے بارہ میں سے دس قبیلوں کو قید کر کے لے گیا تو اسرائیل کی تمام کتب تباہ ہو گئیں۔ اور پھر جب ایک سو سال بعد یہ لوگ واپس آئے تو عزرا نبی کی کوشش سے بائبل کو دوبارہ مرتب کیا گیا۔ جس کی وجہ سے تاریخ کے بہت سے واقعات ضائع ہو گئے۔ اس لیئے یہ کتابِ مقدس موسیٰ کے ایک ہزار سال بعد کی ہے۔

اگر موسیٰ کی کتب میں بیت اللہ شریف کا ذکر نہیں ملتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت موسیٰ حضرت ابراہیمؑ سے چار سو سال بعد کنعان سے دُور مصر میں پیدا ہوئے۔ اس لئے وہ اپنے بزرگوں کے نام سے کما حقہٗ واقف نہ تھے۔ اور اپنے عرب اسماعیلی بھائیوں سے تو اُن کا کوئی رابطہ ہی نہ تھا۔ علاوہ ازیں موسیٰ کی کتابوں میں سے واقعات کی تفصیل تلاش کرنا عبث ہے۔ مذہبی کتابیں تاریخ کا صرف حسب ضرورت ذکر کرتی ہیں۔ وہ تاریخی جزئیات سے چنداں سروکار نہیں رکھتیں۔ چنانچہ کُتب موسیٰؑ میں آدمؑ اور نوحؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ کے درمیانی دَور کی تاریخ ناپید ہے۔ حالانکہ ان کے بغیر اسرائیلی تاریخ نامکمل ہے۔ آپ جناب مسیحؑ کی زندگی کے واقعات کو لیجیئے۔ پیدائش کے بعد وہ بارہ سال کی عمر میں ہیکل میں دکھائی دیتے ہیں اور پھر تیس سال کی عمر میں بپتسمہ لینے کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی اکثر تیس سالہ زندگی پردۂ اخفاء میں ہے۔ پس کتاب موسیٰ میں مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر نہ ملنا اس بات کا ثبوت نہیں کہ ابراہیمؑ نے بیت اللہ تعمیر نہیں کیا تھا۔ پھر یہود کے دل میں عربوں کے خلاف جو کینہ ہے۔ اس کی موجودگی میں انہیں کب گوارا تھا۔ کہ

وہ مکہ میں ابراہیمؑ کے ہاتھوں بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر کرتے اور آلِ اسمٰعیلؑ کی عظمت کا اقرار کرتے۔

آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ توحید پرست تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند حضرت اسماعیلؑ اور بیوی ہاجرہ کو آسمانی بشارتوں کے ماتحت مکہ میں آباد کیا۔ کیا انہوں نے اس بستی اور اپنی نسل کے لئے عبادت خانہ تعمیر نہ کیا ہوگا؟ ایک عام مذہبی انسان آج بھی جہاں آباد ہوتا ہے۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق وہاں عبادت گاہ تعمیر کرتا ہے۔ تو ایک نبی، حضرت ابراہیم ایسا اللہ کا رسول اس سے کیسے غافل رہ سکتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی اولاد کو مکہ میں آباد کرتے وقت سب سے پہلے بیت اللہ تعمیر کیا۔ پھر مکہ میں بیت اللہ کی تعمیر کا حال حضرت موسیٰؑ کی بجائے آلِ اسماعیلؑ عربوں سے دریافت کرنا چاہیئے۔ جو روزِ اوّل سے یہاں آباد ہیں۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے حکم کے مطابق اسی زمانے سے عرب کے گوشے گوشے سے یہاں ہر سال حج کے لئے جمع ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اور حج کے ذریعے سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے عظیم واقعات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ قرآن نے اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس دور کے کسی عرب، یہودی، نصرانی یا مجوسی نے اس سے اختلاف نہ کیا۔ ماسٹر صاحب! آپ اپنی کم علمی، طویل عمری اور تعصّب کی وجہ سے معذور ہیں۔ ورنہ ایسی بودی دلیل نہ دیتے۔

—— ٭٭ ——

بزرگ ابراہیمؑ کی توہین کیسے؟

"یہ بزرگ ابراہیم کی نسل کی توہین ہے۔ کہ خانہ کعبہ میں نسل ابراہیمؑ ۳۶۰ بتوں کی پوجا میں گر گئی۔ اور وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے۔"

ان الفاظ میں ماسٹر صاحب نے نسل ابراہیمؑ سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ مگر انہوں نے اس بات سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ کہ کسی شخص کی نسل کا ہر فرد ہمیشہ نیک نہیں رہتا۔ اور ہر قوم کی تاریخ کا ہر ورق ہمارے دعوے پر گواہ ہے۔ اگر کسی نبی کی امت اور نسل کسی وقت راہِ حق سے بھٹک جائے۔ تو اُس نبی کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کتاب مقدس کا ایک اصول پڑھیے۔

"اگر تو کبھی خداوند اپنے خدا کو بھولے اور اور معبودوں کا پیرو بن کر ان کی عبادت اور پرستش کرے تو میں آج کے دن تم کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ تم ضرور ہی نیست و نابود ہو جاؤ گے۔ جن قوموں کو خدا تمہارے سامنے ہلاک کرنے کو ہے۔ ان کی طرح تم بھی اپنے خداوند کا حکم نہ ماننے کے سبب ہلاک ہو جاؤ گے۔"

(استثنا ۸: ۱۹ - ۲۰)

حضرت نوحؑ کے نافرمان بیٹے کی وجہ سے نوحؑ کی ہتک نہیں ہوتی۔ اگر حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے اپنے بھائی یوسفؑ کو بیچ ڈالا۔

تو کیا یہ یعقوبؑ اور ان کی نسل کی توہین ہے ؟ اسرائیلی تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے ۔ جو اسرائیلیوں کی گمراہی ، گوسالہ پرستی، نبیوں کی نافرمانی، بت پرستی، سبت کی بے حرمتی ۔ اور موسوی شریعت کی مخالفت کے عکاس ہیں ۔ کیا جناب مسیحؑ نے اپنے زمانے میں ابراہیمؑ کی نسل کی گمراہی اور بدکرداری کا ذکر نہیں کیا ۔ اور انہوں نے قوم کے بزرگوں کو ریاکار ، افعی اور سانپ کے بچے تک نہیں کہا ۔ کیا جناب نے ہیکل کو ان ہی بدکردار فرزندانِ ابراہیمؑ سے پاک نہیں کیا تھا ؟ جیسا کہ لکھا ہے

"اور یسوع نے خدا کی ہیکل میں داخل ہو کر ان سب کو نکال دیا جو ہیکل میں خرید و فروخت کر رہے تھے ۔ اور صرافوں کے تختے کبوتروں کی چوکیاں الٹ دیں اور ان سے کہا ۔ کہ لکھا ہے ۔ کہ میرا گھر دعا کا گھر کہلائے گا ۔ مگر تم اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بناتے ہو ۔" (متی ۲۱ - ۱۲ - ۱۳)

پھر کیا ہم مختلف زمانوں کے اسرائیلیوں کی بدکرداری کی مثالیں نہیں پاتے ۔ تو اگر اسماعیلؑ کی اولاد میں بت پرستی آگئی اور انہوں نے خدا کے پہلو بہ پہلو بتوں کو معبود بنا لیا ۔ تو اس سے ابراہیمؑ کا کیا بگڑا ۔ خود مسیحؑ کے ماننے والوں میں شدید اختلافات اور بدکرداری کی لہر حضرت مسیحؑ کی ذاتی عظمت کو مجروح نہیں کر سکتی ۔ آپ کے اس طریق استدلال کی کوئی ہوشمند تائید نہیں کرے گا ۔ البتہ اسماعیلیوں کو اسرائیلیوں پر یہ فوقیت حاصل ہے ۔ کہ جہاں اسرائیلیوں نے اپنے نبیوں سے دشمنی کی ۔ انہیں قتل کیا اور صلیب پر لٹکایا ۔ انبیاء کی تعلیم کو پسِ پشت ڈالا اور اسے بگاڑا وہاں جب اسماعیلیوں کے سامنے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے توحید اور اخلاقِ عالیہ کی تعلیم پیش کی۔ تو مشرکینِ عرب نے بتوں کو خیر باد کہہ دیا۔ بدکاری، لوٹ کھسوٹ، کذب و افترا، حرام خوری۔ شراب نوشی جوا۔ مجلسی استیصال، حسب و نسب کا غرور اور دیگر اخلاقی برائیوں کو چھوڑ دیا اور توحید، انصاف، آزادی، حریتِ فکر، احترام انسانیت اور فلاح انسان کے لئے تن من دھن سے بدی کی قوتوں کے مقابل ڈٹ گئے۔ اور اگر ہمارے اس بیان میں شک ہے تو پھر بتایئے کہ آپ کے خداوند کی زندگی میں آلِ اسحاق کے ہاتھوں ان کی تعلیم اور مشن کا کیا حشر ہوا کیا آپ اپنے خاص شاگردوں کی بھی اصلاح کر سکے۔ اور ان میں اتنی قوتِ ایمان بخش سکے کہ وہ آپ کی مصیبت کے وقت ثابت قدم رہتے۔

پھر اسرائیلیوں سے متعلق کتابِ مقدس کے اس بیان کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے۔ کیا اس سے بزرگ ابراہیمؑ، اسحٰقؑ یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کی نسل کی توہین ہوئی یا نہیں۔ ٹھنڈے دل سے پڑھیے۔

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں ...... میں بس گئے۔ اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور اُن کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔ اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور خداوند اپنے خدا کو بھول کر بعلیم اور یسیرتوں کی پرستش کرنے لگے۔"

(قضاۃ ۳/ ۵-۷)

اگر عربوں میں سے بعض لوگ غیرت کے غلط تصور کے زیر اثر بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ تو اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔

خود ہمارے ملک میں بعض جاہل راجپوت لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیتے تھے اور بیوہ لڑکیوں کو خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ لیکن اس جہالت کی ذمہ داری دوسروں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور نہ ہی یہ رسم ان کے مذہبی بزرگوں کے لئے توہین کا باعث ہے۔

البتہ عربوں کے متعلق یہ بہتان ہے کہ وہ چھ سالہ بچیوں سے شادی کرتے تھے۔ کم از کم اسلام کے دور میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں، کہ اسلام اور مسلمانوں کے مجوسی، یہودی اور عیسائی دشمنوں نے اپنے باطل عقاید کے مقابلے میں اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی سے جل بھن کر بعض شادیوں کو غلط رنگ میں پیش کیا۔ ورنہ اسلامی دور میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ نہ کسی باپ کو اپنی چھ سالہ بچی کو کسی کے نکاح میں دینے کا خیال آ سکتا تھا۔ نہ کوئی شخص چھ سالہ بچی کو بیوی بنا کر اپنے گھریلو سکون کو تباہ کر سکتا تھا۔

اسی طرح گو اسلام نے غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی اور حریّت کے لئے "فکّ رقبۃ" (گردنوں کو آزاد کرانے) کے لئے حکم دیا۔ اور جھوٹی قسم کھانے روزہ توڑنے، ظہار کرنے، اور بعض دیگر قصوروں کی سزا کے طور پر غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا حکم دیا ہے۔ تاہم اسلام سے قبل لونڈیاں تھیں مگر وہ گھروں کا حصہ بن چکی تھیں۔ اور اسلام نے ان کی آزادی کی تلقین کے ساتھ انہیں اپنے جیسا کھانے اور پہننے اور حُسنِ سلوک کی تلقین کی۔ اور اگر کوئی جنگ میں قید ہونے والی عورت رضامند ہوتی تھی تو اس سے شادی کی اجازت تھی یا وہ مقررہ رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتی تھی۔ ورنہ اسلام میں لونڈیوں کی صورت میں عورتوں کی خرید و فروخت کرنے اور ان سے بدکاری کی قطعی ممانعت تھی۔

لیکن عربوں کے غم میں دبلے ہونے والے ماسٹرجی ! اسلام نے تو غیر محرم عورتوں کی طرف دیکھنے سے روکا ہے ۔ اور حکم دیا ہے کہ مسلمان مرد اور عورتیں چلتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھیں ۔ اس بات کی اجازت نہیں دی ۔ کہ شریف خواتین کے حصول میں ناکام ہو کر فاحشہ عورتوں سے میل ملاپ رکھیں ۔ ان کے ہاتھوں جسم پر خوشبو لگوائیں ۔ اور ان کے نرم و نازک بالوں اور ہاتھوں سے پاؤں صاف کروائیں ۔ پھر آپ کے خداوند کی اسرائیلی قوم نے تو غیر عورتوں سے بدکاری کا اذنِ عام دے رکھا تھا ۔ جس کی تکمیل مسیح کا ایک فریضہ تھا ۔ اور جس کے زیر اثر مغرب کی مسیحی اقوام نے نیک و بد کی تمیز ختم کر رکھی ہے ۔ لگے ہاتھ ایک دو حوالے پڑھ لیجئے ۔ شاید اسماعیلیوں کے خلاف زبان کھولنے کے بعد آپ کو رہی سہی شرم کا احساس ہو ۔

جنابِ موسیٰ کا حکم

جب موسیٰ کے حکم سے اسرائیلی سپہ سالاروں نے عدیان کے پانچ بادشاہوں کو قتل کیا ، بچوں اور عورتوں کو اسیر کیا ۔ ان کے چوپائے اور بھیڑ بکریاں اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا ۔ ان کے شہروں اور چھاونیوں کو جلا ڈالا

(گنتی باب ۔ ۳۱)

اور قیدی جانور اور اموال لے کر موسیٰ کے پاس آئے تو موسیٰ نے جھلا کر سردارانِ لشکر سے فرمایا :۔

"کیا تم نے سب عورتیں جیتی بچا رکھی ہیں ، دیکھو انہوں ہی نے بلعام کی صلاح سے فغور کے معاملے میں بنی اسرائیل سے خداوند کی حکم عدولی

کرائی ۔ اور یوں خداوند کی جماعت میں وبا پھیلی ۔ اس لئے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں ۔ سب کو مار ڈالو ۔ اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں ۔ ان کو قتل کر ڈالو ۔ لیکن ان لڑکیوں کو جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں ۔ اپنے لئے زندہ رکھو ۔"

(گنتی ۳۱ : ۱۵ - ۱۷)

یہ وہ پاکیزہ شریعت ہے ۔ جس کی ترویج اور تکمیل کے لئے رحم کے دیوتا مسیح تشریف لائے ۔ اور جس کی موجودگی میں ماسٹر صاحب اسماعیلیوں پر طنز کرتے ہیں ۔ کیا جناب کے پاس چلو بھر پانی بھی نہیں ؟

حسبیوں کا قتلِ عام

جس طرح اسرائیلی دو ہزار سال کے بعد رحم اور امن کے شہزادے مسیح کے درندہ صفت بیرووں مغربی استعمار پرستوں کی مدد سے فلسطینی اسماعیلیوں کی نسل کشی میں مصروف ہیں ۔ اسی طرح موسےٰ کے زمانہ میں چھ لاکھ اسرائیلی مصر سے نکل کر فلسطین کے قدیم شہروں پہ لشکر کشی کر رہے تھے اسی علاقے میں حسبیوں کا لشکر اپنے بادشاہ سیحون کے ماتحت اپنے ملک کی آزادی اور آبرو کی حفاظت کے لئے نکلا تو بقول موسیٰ :-

" خداوند ہمارے خدا نے اُسے ہمارے حوالے کر دیا ۔ اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کے سب آدمیوں کو مار لیا اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہروں کو لے لیا اور ہر آباد شہر کو عورتوں اور بچوں سمیت بالکل نابود کر دیا اور کسی قوم کو باقی نہ چھوڑا

(استثنا ۲ : ۳۳ - ۳۴)

پھر سموئیل نبی نے ساؤل کو حکم دیا کہ تو عمالقہ کے مقابل جا اور :-
"عمالیق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے۔ سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر۔ بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے اور شیر خوار گائے، بھینس اور بھیڑ بکریاں، اونٹ اور گدھے سب کو قتل کر ڈال۔"

(سموئیل ۱، ۱۵ : ۳)

ہم اختصار کے طور پر دو حوالوں پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ورنہ

در محفل رندان خبرے نیست کہ نیست

؎ اتنی نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے جب کبھی دشمن کے مقابل لشکر بھیجا تو یہی حکم دیا کہ :-

۱۔ عورتوں، بچوں اور ضعیفوں پر ہاتھ نہ اٹھانا
۲۔ جو لوگ خانقاہوں میں یادِ الٰہی میں مصروف ہوں۔ انہیں قتل نہ کرنا۔
۳۔ جو لوگ میدانِ جنگ میں تمہارا مقابلہ نہ کریں۔ انہیں کچھ نہ کہنا۔
۴۔ فصلوں اور پھلدار درختوں کو نہ کاٹنا۔
۵۔ گھروں اور بستیوں کو برباد نہ کرنا۔

ان حقائق کے بعد آپ سے یہی مطالبہ ہے کہ اپنی معلومات درست کر لیجئے۔

حماقت پر حماقت

ماسٹر صاحب نے تاریخ میں ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ جس کا کتبِ عالم میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ آپ لکھتے ہیں کہ :۔

"حضور صلعم کی وجہ سے عرب میں اخلاقی عروج کو ہوا دینے کے لئے آلِ ابراہیمؑ کے اخلاقی زوال کی کہانی قابلِ تسلیم نہیں"

اس کو کہتے ...... باش و ہر چہ خواہی بگو۔ گویا آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت عرب ایک خدا کو مانتے تھے۔ امانت و دیانت کے پتلے تھے۔ زنا۔ شرابنوشی اور قمار بازی سے دُور تھے۔ ملک میں امن و امان قائم تھا۔ لوٹ کھسوٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اور ان حالات میں بعض قبائل نے یہودیت اور نصرانیت قبول کر کے پرلے درجے کی حماقت کی تھی"

پادری جی! آپ کے قربان جائیں۔ آپ نے اسلام سے چودہ سو سال بعد کون سی کتاب سے یہ معلومات حاصل کی ہیں؟ اور نہیں تو کسی یہودی یا نصرانی مورخ کی کتاب کا حوالہ ہی دیجئے۔ اگر یہ ایسا ہی تھا تو پھر اسلام کی طرف سے توحید، عبادتِ الٰہی، احترامِ انسانیت، مساوات، نسلی امتیازات کے خاتمے، شراب۔ زنا۔ استیصال لوٹ کھسوٹ اور کذب و بہتان سے بچنے کی دعوت پر مکہ کے قریش اور عرب کے مشرک اسلام کے خلاف کیوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور پھر جس رحمتِ عالم نے انہیں دوبارہ ملتِ ابراہیمؑ اور انبیاء کی تعلیم پر کاربند ہونے کی دعوت دی۔ وہ بھی تو آلِ ابراہیم ہی کا

گُل سرسبد تھا۔ جسے آلِ ابراہیمؑ نے تو قبول کر کے اس کی دعوت کی صداقت پر مہر ثبت کر دی۔ اس کے علم کے نیچے دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مالک ہوئے۔ اور نئی تبدیلی کے بعد بکھری ہوئی آلِ ابراہیمؑ صدیوں تک علم، سائنس، اخلاق، حریت اور مساوات کا روشن مینار بن گئی۔ مگر آپ ہیں کہ ان کے دورِ جاہلیت کی عظمت کا رونا لئے بیٹھے ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

آپ کی بصیرت کے لئے دو غیر مسلم مؤرخوں کی آرا پیش خدمت ہیں۔ مشہور متعصب عیسائی مورخ سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتا ہے:-

"آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے عرب کی حالت مذہبی تبدیلی کے قبول کرنے سے ایسی ہی دور پڑی ہوئی تھی۔ جیسے باہمی اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے سے دور تھی۔ عربوں کے مذہب کی بنیاد ایسی سخت بت پرستی پر تھی۔ جس کی جڑیں نہایت گہری لگ چکی تھیں۔ جس نے صدیوں تک مصر و شام کے عیسائیوں کی تمام کوششوں کا ایسا مقابلہ کیا تھا کہ گویا ان کا اس پر کوئی اثر ہی نہ تھا۔"

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے توہمات کے بہت سے تاریک سائے مٹا دیئے۔ جنہوں نے صدیوں سے ملک کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اسلام کی گرج کے ساتھ بت پرستی مٹ گئی۔

اور خود محمدؐ کی طرح ان کے پیروکاروں کے دلوں میں توحید، کامل اسمائے الٰہی اور قدرتِ الٰہی کا عقیدہ راسخ اور زندگی میں قائم ہوگیا مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور اس کی رضا کے سامنے کامل طور پر جھک جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ (جو لفظ اسلام کی روح ہے) اسلام میں سماجی اعلیٰ اخلاق کی بھی کمی نہیں۔ دائرہ اسلام میں سب سے برادرانہ محبت کا مطالبہ پایا جاتا ہے۔ دختر کشی کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ یتیموں کی حفاظت کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ اور غلاموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم ہے۔ شراب کی بندش کر دی گئی ہے۔ اور اسلام منشیات سے پرہیز کے احکام پر دیگر تمام مذاہب کے مقابلے میں کامیابی پر سب سے زیادہ فخر کر سکتا ہے"۔

اس بات پر تعجب کیسا؟

پادری جی نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ "بزرگ ابراہیمؑ کے بیٹے بزرگ اضحاق کی نسل کو نبوت، حکومت اور اتنی فضیلت بخشی۔ لیکن نسلِ حضرت اسماعیلؑ کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور وہ جہالت کی تاریکیوں میں گم ہو گئی"۔

مذہبی دنیا میں کسی شخص نے جہالت کا اتنا گھٹیا مظاہرہ ماسٹر جی سے پہلے نہیں کیا ہوگا۔ آپ نے بنی اسماعیلؑ پر بنی اسحاق کی فوقیت کا ذکر نبوت، حکومت اور فضیلت کے ضمن میں کیا ہے۔ آیئے ان باتوں کا تجزیہ کریں۔

۱۔ نبیوں کی کثرت

کسی قوم میں ایک یا زیادہ نبیوں کا آنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ قوم مذہب اور اخلاق کے میدان میں بڑی بے دین۔ خودسر، نافرمان، ظالم، انتشار پسند اور حق کی دشمن تھی۔ جس کی اصلاح کے لئے نبیوں کی ضرورت پڑتی رہی۔ بنی اسرائیل میں تو ایک ایک وقت میں ایک سے زیادہ نبی آتے رہے۔ مگر یہ بدبخت قوم انبیاء کو قتل کرتی یا انہیں جھوٹا ٹھہرا کر انکار کرتی۔ یعقوبؑ نبی تھے۔ مگر ان کی اولاد ہی نے ان سے بُرا سلوک کیا۔ مصر میں اسرائیلیوں کی طرف موسیٰؑ اور ہارونؑ دو نبی آئے۔ مگر اسحاقؑ کی اس بدبخت اولاد نے قدم قدم پر اپنے محسن ہادیوں کی شدید مخالفت کی اور وہ دونوں کامیابی سے قبل ہی اس قوم کی مخالفت کی موجودگی میں انتقال کر گئے۔ موسیٰؑ اور مسیحؑ تک اس قوم کی دین سے سرکشی کی داستان طویل ہے حتیٰ کہ انہوں نے حضرت یوحنا اور مسیحؑ کو رد کر کے قتل اور مصلوب کیا۔ پس کیا بنی اسحاق میں نبیوں کی کثرت قابلِ فخر بات ہے؟ یہ اس بدبخت قوم پر خدا کا تو بار بار احسان تھا۔ مگر ساتھ ہی ان کی پستی پر آسمانی مُہر بھی تھی۔ اور یقیناً وہ اس بدبختی میں اسماعیلیوں اور دیگر اقوام سے بازی لے گئی۔ اور سب سے زیادہ لعنت کا شکار ہوتی رہی۔

بنی اسحاقؑ کے برعکس بنی اسماعیلؑ یعنی عرب مدتوں دین ابراہیمؑ پر قائم رہے۔ مکہ میں بیت اللہ کی موجودگی، مناسکِ حج اور دینی مرکزیت نے انہیں بیرونی مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی برائیوں سے بچائے رکھا۔ صحرائی زندگی کی وجہ سے ان پر دوسرے مذاہب کے عقاید نے ان کے سیاسی

افکار مذہب اور یک جہتی کو چنداں متاثر نہ کیا۔ اس لئے ان میں نبیوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ پڑی۔ جو ان کی خوبی ہے۔ برائی نہیں۔ پھر جب ان میں عیسائیت، یہودیت اور شرک کے زیر اثر کچھ دینی اور اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوئیں، تو اللہ تعالےٰ نے نسل ابراہیمؑ کی اس شاخ کی برومندی کے لئے دنیا کا عظیم ترین نبی بھیجا۔ جس کی تعلیمات، سیرت اور عمل نے ان عربوں کو دین، علم و سائنس اور اخلاقی پاکیزگی میں دنیا کا راہنما بنا دیا۔

آیا خیال شریف میں کچھ تو سوچ کر بات کیا کیجئے۔

حکومت

ہمارے بھائی نے اسرائیلی اور اسماعیلی حکومت کا کبھی مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ورنہ اسماعیلیوں کے سیاسی اقتدار کے مقابلے میں اسرائیلیوں کا ذکر تک نہ کرتے۔

اسرائیلی اقتدار

آپ بنی اسرائیل کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ ان کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی یہ عروج فلسطین، شام کے کچھ علاقے، یردن اور صحرائے سینا تک محدود رہا۔ یا مختصر مدت کے لئے قرب وجوار کے بعض قبائل نے ان کی بالا دستی قبول کر لی۔ پس یہ حکومت بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کی ریاستوں سے عبارت تھی۔ لیکن یہ بھی کب تک رہی۔ یعقوبؑ کا کل ستر افراد پر مشتمل مختصر سا خاندان غربت سے تنگ آ کر مصر پہنچا اور وہاں چار سو سال تک فرعون کا غلام رہا۔ موسیٰؑ نے غلامی سے نکالا تو چالیس سال تک صحرا میں دھکے کھائے۔ پھر

فلسطین میں تھوڑے سے علاقے پر آزاد ریاست قائم کرلی۔ اس کے بعد بابلیوں، ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں کی غلامی میں صدیاں گزاریں۔ درمیان کے سو سال بخت نصر کی اسیری میں رہے۔ پھر رومی شہنشاہ ٹائٹس نے ۷۰ء میں ان کی ہیکل سلیمانی کو برباد کیا۔ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور یہ آلِ اسحاق ایسی منتشر ہوئی کہ گذشتہ دو ہزار سال سے ممالکِ عالم میں بکھری پڑی ہے۔ اور آج تک اپنے مخالف حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امتوں کی پناہ میں زندہ رہے۔

"کیا آپ کو آلِ اسحاق کی اسی حکومت میں عظمت نظر آئی ہے؟"

اسماعیلی حکومت

بنی اسرائیل کے برعکس ہمیں تاریخ کا وہ دور کہیں نظر نہیں آتا جب بنی اسماعیل نے کسی غیر کی غلامی کی ہو۔ بلکہ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے دیگر عرب قبائل اور ہمسایہ حکومتوں نے انہیں ہمیشہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا۔ جب آنحضرت صلعم نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو بنی اسحاق کی روش کے خلاف بنی اسماعیلؑ نے آپ کے آسمانی پیغام کو قبول کرلیا۔ اور آپ کی حیاتِ طیبہ ہی میں توحید پر قائم ہو کر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے۔ اور ایک مختصر سی مدت میں ایک عظیم سلطنت کے مالک بن گئے۔ جو مشرق میں وسط ایشیا اور سندھ سے مغرب میں مراکش اور سپین تک اور شمال سے آرمینیا سے جنوب میں عدن تک وسیع تھی۔ پھر آلِ اسماعیل نے قرطبہ، قاہرہ، دمشق، بغداد اور بخارا میں عظیم تعلیمی مراکز قائم کئے۔ جہاں سے یورپ میں علوم کی روشنی پھیلی اور یورپی طلباء ان اسماعیلی مراکز میں ایک ہزار سال تک علوم کی پیاس بجھانے آتے رہے۔

اور یہیں سے مغرب میں احیائے علوم کی تحریک چلی۔ ان ہی تعلیمی مرکزوں میں ابن رشد، جابر بن حیان، البیرونی، غزالی، فخر الدین رازی، مسعودی، ذکریا رازی، عمر خیام، نظام الملک طوسی، بوعلی سینا ایسے ہزاروں اہلِ فکرو دانش اُبھرے۔ جن کی تصانیف صدیوں تک یورپی درسگاہوں میں رائج رہیں۔ جن کی مثال اسرائیلی دَور میں مفقود تھی۔

گو ان میں سے بعض علاقوں سے اسماعیلی اقتدار جاتا رہا۔ مگر ان کا مذہب اور دینی بھائیوں کا اقتدار آج تک وہاں قائم ہے۔ اور آج بھی وہ مراکش الجیریا، ٹیونس، طرابلس۔ مصر۔ سوڈان، شام۔ لبنان، سعودی عرب، یمن، عراق اور عرب امارات میں آزاد اور حکمران ہیں۔ اور یہ ایسی عظمت ہے جو آلِ اسحاق کو کبھی خواب میں بھی نصیب نہیں۔

عظمت

مذکورہ بالا حقائق کی موجودگی میں اسرائیل کی عظمت کا ذکر فضول ہے۔ اسے اگر چند روزہ اقتدار کبھی حاصل ہُوا۔ تو وہ اس دَور کے چند کمزور قبائل میں تھا۔ ورنہ وہ یونانیوں۔ رومیوں، ایرانیوں اور عربوں کے مقابلے میں کبھی ٹھہر نہ سکے۔ بلکہ ان اقوام کے رحم و کرم پر جیتے رہے۔ قرآن حکیم نے ان کی مقامی عظمت کا ذکر کیا ہے۔ تو وہ اپنے دور کے یہود کو احساس دلایا ہے۔ کہ کسی زمانے میں اللہ تعالےٰ نے تمہیں ہم عصر جماعتوں پر فضیلت بخشی۔ مگر تم نے ناشکری کی اور اس سے محروم ہو گئے۔ اور یہ فضیلت بھی اسی قدر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی الٰہی اور نبیوں کے ذریعے ہدایت بخشی۔ جس سے غیر اسرائیلی لوگ محروم

تھے مگر یہ فضیلت عارضی تھی۔ کیونکہ وہ لوگ دینی تعلیمات کو فراموش کر کے کفر کی تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ اور اس ابدی لعنت کا شکار ہو گئے جو حضرت مسیح اور دیگر انبیاء کی دشمنی کی بدولت انہیں نصیب ہوئی پادری صاحب کسی کا شعر ہے کہ:۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا است

کارِ طفلاں تمام خواہد شُد

مجھے ان شاگردوں پر رحم آتا ہے جو آپ ایسے "نابغۂ روزگار" استادوں سے تعلیم حاصل کرتے رہے اور ان مسیحی دوستوں پر ترس آنے لگا ہے، جو آپ سے بائبل کا درس لیتے ہیں۔

جہالت در جہالت

آپ نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اگر حضور صلعم نے بزرگ ابراہیمؑ کا حنفی مذہب اختیار کیا تھا۔ تو پھر جب کہ بزرگ ابراہیمؑ کا ۹۰ سال کی عمر میں ختنہ ہوا تھا تو حضور صلعم نے کیوں ختنہ نہ کروایا۔ اگر آپ سنتِ رسول پر چلتے ہیں تو ختنہ کیوں کرواتے ہیں۔ جب کہ قرآن نے غیر منکوحہ لونڈی رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ تو آج کیوں یہ بات قابلِ نفرین ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو موجودہ تہذیب رائج ہونے کا علم نہ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے سوا تمام اقوام نے کثرتِ ازدواج کو ختم کر دیا ہے۔"

← پادری صاحب کی پریشان خیالی اور تاریخ سے جہالت پر قربان جائیے۔ آپ کے وسیع علم پر مسیحی دنیا کو چاہیئے کہ آپ کو نوبل پرائز

دے کر تبلیغی فرائض سے سبکدوش کر دے۔

آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہی حضرت اسماعیلؑ کا ختنہ ہوا تھا۔ اور اسماعیلؑ کے زمانے سے یہ سنت آلِ اسماعیل میں پابندی سے جاری رہی ہے۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں یہ سنت جاری تھی اس لئے آپ کا ختنہ بچپن ہی میں اسی طرح ہوا تھا۔ جس طرح آپ کی سنت کے طور پر آج بھی ہر مسلمان کا ختنہ ہوتا ہے۔

یہ بدبختی اسرائیلی عیسائیوں کی قسمت میں تھی کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کی سنت اور تعلیم کو ترک کیا (لوقا ۲ : ۲۱)

اور سنت ابراہیمی کے ایک دشمن پولوس کی پیروی کر کے ختنہ کی سنت ختم کر دی اور ان یہود کو بھی گمراہ کر دیا۔ جو مسیحؑ اور پولوس پر ایمان لا کر حضرت ابراہیمؑ کی جماعت سے کٹ جاتے ہیں۔

(پیدائش ۱۷ : ۱۰ - ۱۴)

پادری جی! کچھ سمجھے؟ نہ آنحضرتؐ نے مسلکِ ابراہیمی سے گریز اختیار کیا۔ اور نہ آج کا مسلمان سنتِ نبوی سے ہٹا ہوا ہے۔ یہ بدبختی آلِ اسحاق کی قسمت میں تھی کہ وہ کتاب پیدائش (۱۷ : ۱۴) کے مطابق ختنہ ترک کر کے آلِ ابراہیمؑ سے کٹ گئے۔ اور مسلمان اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

اسی طرح یہ کہنا جہالت ہے کہ قرآن حکیم نے غیر منکوحہ لونڈیاں رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ قرآن کا حکم ہے۔

وَانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم

یعنی جو تم میں مجرد ہیں۔ ان کے نکاح کردو۔ اور اپنے صالح غلاموں اور لونڈیوں کے بھی" (سورہ نور)

اسی طرح سورۂ نساء میں ہے " اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے نکاح کرے۔ جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔ اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ کہ تم آپس میں ایک ہی ہو۔ سو انہیں ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح میں لاؤ۔ اور ان کو دستور کے موافق ان کے مہر دے دو۔ پاک دامن ہوں نہ کھلی بدکاری کرنے والی۔ اور نہ در پردہ آشنا رکھنے والی۔ پھر جب وہ نکاح میں لائی جائیں۔ تو اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ تو ان کے لئے آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی سزا ہے۔ یہ تم میں سے اس کے لئے ہے۔ جسے ہلاکت میں پڑنے کا خوف ہو اور اگر تم صبر کرو۔ تو تمہارے لئے بہتر ہے" (النساء ۲۵)

ان آیات میں غلاموں اور لونڈیوں کی شادی کا ذکر ہے۔ نکاح کے بغیر گھر میں ڈال لینے کی اجازت نہیں۔ یہ لونڈیاں اسلام سے قبل مشرکین کے گھروں میں تھیں۔ اسلام نے اول تو ان کی آزادی کی ترغیب دی۔ بصورت دیگر ان سے شادی کو کہا۔ اور اگر بعد میں کسی مسلمان نے لونڈی کو بلا نکاح گھر میں ڈال لیا۔ تو اس کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اگر اسلام میں تمام دشمن عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کا حکم ہوتا۔ تو پھر ایران، شام، فلسطین، مصر، طرابلس ٹیونس وغیرہ مفتوحہ ملکوں کی کروڑوں عورتیں، رکھنے کی مسلمانوں کے گھروں میں کہاں گنجائش تھی۔ مگر یہ بات تو صرف اہل دانش کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

اس کے برعکس موسوی شریعت میں تو عام اجازت تھی کہ تمام مخالف عورتوں کو بلا نکاح گھروں میں ڈال لو۔ جیسا کہ داؤد اور سلیمان کی زندگیوں سے عیاں ہے۔ لونڈیاں بنانے کی دو مثالیں تو ہم اوپر دے چکے ہیں۔ یہاں ایک اور مثال دے کر معاملہ اہل علم پر چھوڑتے ہیں۔

عہد نامہ عتیق کی کتاب قضاۃ میں لکھا ہے۔ کہ بنی بنیمین کو بیویوں کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا حل اسرائیلی بزرگوں نے یہ تجویز کیا۔ کہ سیلا کے مقام پر سال بسال عید منائی جاتی ہے۔ اور وہاں سیلا کی لڑکیاں ناچ گانے کے لئے اکٹھی ہوتی ہیں۔ پس :۔

"انہوں نے بنی بنیمین کو حکم دیا کہ جاؤ اور تاکستان میں گھات لگائے بیٹھے رہو اور دیکھتے رہنا۔ کہ اگر سیلا کی لڑکیاں ناچ ناچنے کے لئے نکلیں۔ تو تم تاکستانوں میں سے نکل کر سیلا کی لڑکیوں میں سے ایک ایک بیوی اپنے لئے پکڑ لینا اور بنیمین کے ملک کو چل دینا۔"

یہ وہ اخلاقی تعلیم تھی۔ جو اسرائیلیوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جس کی تکمیل کے لئے جناب مسیح آئے تھے۔ اور پادری جی نے تو کسی کو بھی نہیں بخشا۔ بلکہ یہ مان رکھا ہے۔ کہ ایک عظیم اسرائیلی ہستی نے سوسائٹی کی گھٹیا عورتوں سے میل ملاپ بڑھایا" ہم انجیل کے اس قسم کے بیان سے نفرت کرتے اور اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ تاہم آپ کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اس کے اثرات کا اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں سے متاثر ہو کر کثرت ازدواج کو چھوڑ دیا ہے۔ ایک نادانستہ جھوٹ

ہے۔ اگر مسلمانوں کو دو یا تین یا چار شادیوں کا حکم ہوتا تو پھر ہر گھر میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں۔ جب کہ اس کے برعکس ہزار میں سے ۹۹۹ گھروں میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں۔ حقیقت اس قدر ہے کہ مسلمانوں میں مخصوص حالات میں چار تک شادیوں کی اجازت ہے۔ اور کہیں کہیں گھروں میں ایک سے زیادہ بیویاں ملتی ہیں۔ لیکن آپ کو اس بات کا احساس نہیں کہ مردوں کی کمی کی صورت میں بیوی کی شدید طویل علالت یا بعض قریبی بیوگاں اور بچوں کی حفاظت کے لئے دوسری شادی اٹل ہو جاتی ہے۔

مگر یورپ میں بیوگاں یا مستورات کی کثرت کے باوجود کثرت ازدواج کی اجازت نہیں۔ اس لئے وہاں مستورات رفیق حیات کی عدم موجودگی میں جس قدر بے سہارا اور بے بس ہو جاتی ہیں۔ اور وہاں خاص کر دوسری عالمی جنگ کی بربادی کے زیر اثر دوسری شادی پر پابندی کی وجہ سے جس قدر بدکاری اور فحاشی پھیلی ہے۔ وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ اور اور اس انتشار سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ کہ خاص حالات میں کثرتِ ازدواج کے اسلامی دستور کو اختیار کر لیا جائے۔ ورنہ مسیحی نظامِ مناکحت کی اتباع میں مجلسی اور اخلاقی خرابی اور بے راہ روی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگے گا۔ مسلمان اس گھٹیا تہذیب سے کیوں متاثر ہوں گے۔ اس کے برعکس اہلِ مغرب کو ایک دن مجبور ہو کر اسلام کی پیروی کرنا ہو گی۔ اور وہ بدکاری کو روکنے کے لئے اسلام کی چوکھٹ پر پیشانی رکھ دیں گے۔ ورنہ بدکاری، زنا، فحاشی اور بداخلاقی کے سمندر میں غرق ہو جائیں گے۔

اُونٹ کی قربانی

آپ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلعم نے بزرگ ابراہیمؑ اور انبیائے بنی اسرائیل کے برخلاف اونٹ کو کیوں حلال ٹھہرایا"؟

ہم پوچھتے ہیں کہ بزرگ ابراہیمؑ نے اونٹ کو حرام کب ٹھہرایا تھا؟ پہلے کتاب پیدائش سے اس کا ثبوت دیجئے۔ پھر سوال کیجئے۔ رہے دوسرے نبی تو اول تو ثبوت دیجئے۔ کہ ان نبیوں کی تعلیمات محفوظ رہی تھیں؟ اور ان نبیوں نے توریت کی کب پیروی اور پابندی کی تھی؟ کیا بائبل کی رُو سے جناب یعقوبؑ نے دو بہنوں راخیل اور لیاہ سے توریت کے حکم کے برعکس شادی نہیں کی تھی۔ اور ان کی لونڈیوں بلہاہ اور زلفہ سے بلا نکاح ہم بستری نہیں کی تھی۔ کیا یہودہ نے اپنی بہو تمر سے زنا کرکے بچہ پیدا نہیں کیا تھا؟ کیا داوٗد نے اوریا کو قتل کرکے اس کی بیوی سے بدکاری نہ کی تھی؟ (ہم ان باتوں سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں) اگر کتاب مقدس ایسے کئی ایک واقعات سے پُر ہے۔ تو اس قسم کے لغو سوالات چھیڑنے سے کیا فائدہ؟ کیا جناب مسیح نے کئی بار انجیل میں توریت کی مخالفت نہیں کی۔ مرقس کے باب پنجم کو غور سے پڑھ جائیے۔ کیا انہوں نے طلاق کے مسئلہ پر موسٰیؑ سے اختلاف نہیں کیا؟ اسی طرح کیا کتابِ مقدس میں نوحؑ کی شراب نوشی، لوطؑ کی شراب نوشی اور بیٹیوں سے زنا کی داستان، ابراہیمؑ اور دیگر انبیاء کے مسلک کے عین مطابق ہے؟ ان واقعات اور اسرائیلی نبیوں کے متعلق کیا آرا ہیں (ہم انبیاء کی شان میں ایسی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں

پر لعنت بھیجتے ہیں)

یاد رکھیے کہ ہمارے عقیدے کے لحاظ سے ہر نبی مطاع ہوتا ہے۔ اپنی وحی کے سوا کسی دوسرے نبی کا مطیع نہیں ہوتا۔ دین کے اصول توحید، رسالت، آخرت پہ ایمان اور اخلاقی اصول برقرار رہتے ہیں۔ اور زمانے کے ساتھ ساتھ شرائط میں تبدیلی ممکن تھی، اسی لئے جناب مسیح نے توریت کی پابندی کے اعلان کے باوجود بعض باتوں سے اختلاف کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالمی نبی تھے۔ آپ کا دائرہ کار عالم گیر اور ابدی تھا۔ اس لئے آپ محدود اسرائیلی شریعت کے پابند نہ تھے۔ آپ نے حکم الہٰی کے مطابق ہی دنیا کو شریعت دی۔ توریت اور انجیل کی شریعت اقوامِ عالم کی اجتماعی زندگی کے لئے سازگار نہ تھی۔ اس لئے قرآن نے اسے ترک کر دیا۔ اور ایک جدید ارفع، اعلیٰ انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق شریعت عطا کی۔

رہا اہلِ کتاب کا کھانا؟ تو اس سے مراد وہ کھانا ہے جس میں اسلام کا حلال بتایا ہوا جانور ہو۔ اور اسے اہلِ کتاب نے اسلامی طریق سے ذبح کیا ہو اور خنزیر کی چربی کی بجائے کسی حلال شئے میں پکایا ہو۔ عام طور پہ یہودی مسلمانوں کی طرح ذبح کرتے ہیں۔ اور خنزیر وغیرہ نہیں کھاتے اس لئے ان کا طعام اللہ کا نام لے کر مسلمان کے لئے کھانا جائز ہے لیکن عیسائی چونکہ خنزیر اور شراب کو حلال سمجھتے اور شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے۔ اور انہوں نے ایک انسان کو خدا بنا کر شرک کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس لئے ان کا ناپاک طعام استعمال

کرنے میں خاص احتیاط درکار ہے ۔ اور اطمینان کر لینا ضروری ہے ۔ کہ ان کی خوراک میں کوئی ایسا عنصر نہ ہو جو اسلامی شریعت میں ممنوع ہو ویسے تو اہلِ کتاب کی لڑکیوں سے اسلام نے شادی کی بھی اجازت دی ہے ۔ مگر اس کے لئے ان کی پاک دامنی اور شرک سے پرہیز شرط ہے کیونکہ مشرک عورتوں سے اسلام نے شادی حرام ٹھہرائی ہے ۔ اور مسیحی لڑکیاں اکثر مشرک ہوتی ہیں ۔

جنت کی نعمتیں | آپ نے جنت کی نعمتوں میں سے شراب ، حوروں کا طنزاً ذکر کیا ہے ۔ وہاں تو شہد اور دودھ اور شفاف پانی کی نہروں ، گھنے باغوں ، گہرے سایوں ، صوفوں پھلدار درختوں وغیرہ کا بھی ذکر ہے ۔ جہاں تک شراب کا تعلق ہے ۔ شراب عربی زبان میں پی جانے والی شے کو کہتے ہیں ۔ شربت کا لفظ اسی سے ہے ۔ آج کل ٹی ۔ وی پہ شربت "روح افزا" کے متعلق سنایا جا رہا ہے ۔ کہ مشرق کا مشروب ہے یہ ، جس سے مراد شربت ہے مے نہیں ۔ اور قرآن میں شراباً طہوراً آیا ہے ۔ یعنی پاک و مطہر شربت

میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جس معاشرے میں زنا کی ممانعت ہو ۔ شراب حرام ہو ۔ بدنظری کی اجازت نہ ہو ۔ نماز ۔ روزہ ۔ حج اور زکواۃ کا حکم ہو ۔ حرام خوری اور حرام کاری منع ہو ۔ ہر شخص کی جان ، مال اور آبرو کی حفاظت کا حکم ہو ۔ دوسروں کے حقوق کو تلف کرنے کی رکاوٹ ہو ۔ یتیموں ، بیواؤں ، مسکینوں ، راہگیروں ، غلاموں ، لونڈیوں اور فاقہ کشوں کی حاجت روائی کی تلقین ہو ۔ اور انسانی زندگی اس دنیا میں

جنت کا نمونہ ہو تو اگر ایسے لوگوں کو دوسری دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے تصور کی حوریں، شراب، شہد اور دودھ کی نہریں ملیں۔ تو آپ کو کیا شکایت ہے۔ ایسے معاشرے کی موجودگی میں تو آپ اور اپنے بال بچے اپنے آپ کو اسی دنیا میں جنت میں محسوس کریں گے، برخلاف اس معاشرے کے جس کا تصور آپ کے ہاں پایا جاتا ہے کہ شراب، زنا۔ بدنظری، لوٹ کھسوٹ عام ہو اور لوگوں کی مجلسی زندگی تہس نہس ہو چکی ہو۔

ماسٹر جی! دعا کیجئے کہ تمام دنیا آئندہ نعمتوں کی خاطر اس دنیا میں شریفانہ زندگی بسر کرے، باقی جنت و دوزخ کا تصور دنیا کے اکثر مذاہب میں ملتا ہے۔ اور اگر ہر قوم اس تصور کو سامنے رکھ کر زندگی گزارے تو یہی دنیا جنت بن جائے۔ مگر آپ یہ دعا کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی نظر میں ہر شخص پیدائشی گنہ گار ہے۔ اس لئے ہر مسیحی فطرتاً گناہ پر مجبور ہے۔ اس کے لئے نیکی اس کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔ اور نجات کے لئے نیک اعمال کی ضرورت نہیں۔ محض مسیح کی صلیبی موت پہ ایمان لانے کی ضرورت ہے۔

ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ جنت میں لوگ شادیاں کریں گے۔ وہاں بچے پیدا کریں گے۔ شراب پی کر بدمستی کا مظاہرہ کریں گے۔ اور لشکر جمع کر کے ایک دوسرے کو لوٹتے پھریں گے۔ وہاں دنیا کی زندگی کے لوازمات کی کوئی حاجت نہ ہوگی۔ اور دنیا کی زندگی میں

اسلام نے ان باتوں پر سخت پابندیاں لگا رکھی ہیں۔

ہم نے پہلے بھی لکھا ہے۔ کہ دینی تعلیمات میں عام لوگوں کو سمجھانے کے لئے دنیاوی چیزوں کا مجازاً ذکر ہوتا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے مشاہدے کے مطابق آسمانی کلام کو سمجھ سکیں قرآن حکیم میں ہے۔ "اس جنت کی مثال (مثل الجنۃ) جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس باغ کی سی ہے۔ جس میں دریا بہتے ہیں۔ جس کے پھل اور سایے دائمی ہیں۔" (۱۳ : ۳۵)

"اس جنت کی مثال جس کا وعدہ نیک بندوں سے کیا گیا ہے اس باغ کی ہے۔ جس میں ایسے دریا بہتے ہیں۔ جن کے پانی کا ذائقہ متغیر نہیں ہوتا۔" (۴۷ : ۱۵)

پھر قرآن حکیم نے صاف الفاظ میں کہا ہے۔ کہ "آئندہ زندگی کی نعمتوں کا اس دنیا کی نعمتوں پر قیاس کرنا غلط ہے"۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا۔ کہ اس کے لئے آئندہ زندگی میں آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے کیا کچھ خفیہ رکھا گیا ہے۔ یہ ان کے ان نیک عملوں کا بدلہ ہے۔ جو انہوں نے دنیا کی زندگی میں کئے" (۳۲ - ۱۷)

اس حقیقت کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی

"اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں۔ کسی کان نے سنیں۔ اور جن کا تصور بھی کسی انسان کے قلب میں نہیں آیا۔" (بخاری ۵۹ : ۸)

اس ضمن میں دورِ اوّل کے مفسّرِ قرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں "جنت میں اس زندگی کی کھانے پینے کی کوئی شے نہیں سوائے نام کے"

اس لئے نعمتوں سے مراد وہ سکون، راحت اور تسکین ہے۔ جو ان اشیاء سے حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ جنت کی چیزیں تمثیل کے طور پر ہیں۔ نہ کہ دنیا کی اشیاء کی صورت میں ہیں۔

قرآن حکیم نے جنت کے لئے "ایمان اور اعمال صالح" کی شرط رکھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ان الابرار لفی نعیم، کہ دنیا میں بھلائی کرنے والے لوگ ان نعمتوں کو حاصل کریں گے۔ یہ میرے بندے ہی نفس مطمئنہ حاصل کریں گے۔ جنت میں انہیں گرمی اور سردی پریشان نہیں کریں گی۔ انہیں پاکیزہ ساتھی (ازواج مطہرہ) ملیں گے۔ ان کی خدمت کے لئے وہاں پیارے پیارے ہمیشہ رہنے والے بچے ہوں گے۔ وہاں امن و سلامتی کی صدائیں گونجتی رہیں گی۔ وہاں بے ہودہ اور جھوٹ باتیں نہ سنیں گے۔ لغو اور گناہ کی باتوں کو دخل نہ ہوگا۔ ان کے دل کینوں سے صاف کر دیئے جائیں گے۔ وہاں انہیں زندگی کی سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی حاصل ہوگی۔ اور یہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ سب انعامات اللہ غفور الرحیم کی طرف سے نیک بندوں کی مہمانی کے طور پر ہیں"

آپ نے یہ ثابت کرنے کی فضول کوشش کی ہے۔ کہ عیسائیت نے

شراب کی مخالفت کی ہے اور اسلام نے نہیں۔ حالانکہ جناب کو معلوم ہے کہ قرآن نے شراب کو سختی سے بند کیا ہے۔ آنحضرت نے اپنی زندگی میں شراب کے برتن تڑوا دیئے۔ شراب گرادی اور اسلام نے شراب نوشی کی سزا اسّی درّے رکھی ہے۔ پھر تمام اسلامی دنیا میں شراب پر بندش چلی آئی ہے۔ پاکستان میں اسلام کے حکم کی وجہ سے شراب پر پابندی ہے۔ اور آج بھی تمام اسلامی ممالک اور اقوام میں شراب کا کم سے کم استعمال ہے۔ اور مسلمان اسے خدائی حکم سمجھ کر اس سے اجتناب کرتے ہیں۔

لیکن جناب مسیحؑ تو اپنے الفاظ میں خود کھاؤ پیو اور شرابیوں کے یار تھے۔ انہوں نے معجزے کے طور پر براتیوں کو شراب تیار کر کے پلائی۔ پھر ایسٹر کے موقع پر۔ عیسائی مذہبی فریضہ سمجھ کر شراب پیتے پلاتے ہیں اور چونکہ ہر عیسائی پیدائشی گنہ گار ہے۔ اور نجات کے لئے منشیات سے پرہیز پر یقین نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ شراب نوشی سے پرہیز نہیں کرتا۔ مسیحی دنیا نے مذہبی لحاظ سے اپنے ممالک میں کبھی شراب کی بندش نہیں کی۔ بلکہ نہ صرف ان کے ممالک میں شراب پانی کی طرح استعمال کی جاتی ہے۔ بلکہ اسے تیار کر کے دنیا بھر میں بیچتے اور اس کی وجہ سے شراب اور اس سے متعلق بدکاری وغیرہ خرابیوں کو رواج دیتے ہیں۔ اور مسیحی دنیا کو بدی کا گہوارہ بنا رکھا ہے۔

ماسٹر جی! اکثر خاموشی ہی بہتر روش ہوتی ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر کیوں نظر نہیں آیا؟

—×—

بائبل مقدس اور کثرتِ ازدواج

آپ کا ارشاد ہے کہ کتاب مقدس نے کثرتِ ازدواج سے منع کیا ہے۔ اور قرآن کی کثرتِ ازدواج اور لونڈیاں رکھنے کی تعلیم کتاب مقدس کے خلاف ہے۔ اسلام میں کثرتِ ازدواج اور لونڈیوں کے متعلق تعلیمات پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن آپ کی تسلی کے لئے مزید وضاحت کی جاتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ

"کتابِ مقدس میں صرف ایک شادی کی اجازت ہے لیکن جن لوگوں نے خدا کے حکم کے خلاف کثرتِ ازدواج کو روا رکھا۔ انہوں نے خدا سے مشورہ حاصل نہ کیا تھا۔ چنانچہ ایسے تمام اشخاص کثیر التعداد عورتوں اور ان کی اولادوں کے سبب سخت پریشان و دکھی ہے۔ اور ان سے گناہ سرزد ہوئے۔"

آپ کو معلوم ہے کہ ان گنہگاروں میں خود بزرگ ابراہیمؑ شامل تھے۔ جن کی کم از کم تین بیویاں تھیں۔ یعقوب کی چھ بیویاں اور لونڈیاں تھیں اور ان کے حرم میں دو سگی بہنیں بھی تھیں۔ پھر عیسو بن اسحاق کے حرم میں چار بیویاں تھیں۔ یہ شادیاں توریت سے پہلے ہوئی تھیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ توریت کو بعد میں بگاڑ کر ایک شادی کا غیر فطری اور ناقابلِ عمل قانون وضع کیا گیا۔ اس قانون کے بعد بھی ہمیں داؤدؑ، سلیمانؑ اور بعض دوسرے بزرگوں کے حرم میں بے شمار بیویاں اور لونڈیاں

ملتی ہیں۔

اب ماسٹر صاحب ان بزرگوں کی مذمت کریں یا کتاب استثناء کو غلط ٹھہرائیں۔ ان کی مرضی ہے۔ ماسٹر صاحب نے ایک مزید شگوفہ چھوڑا ہے کہ سارا کے کہنے پر اور خدا کے حکم سے ہاجرہ اور اس کے فرزند اسماعیلؑ کو بزرگ ابراہیمؑ نے گھر سے نکال دیا۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ یہ کثرتِ ازدواج کی مخالفت کی وجہ سے تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو ہاجرہ سے شادی سے پہلے سارہ اور اس کا خدا کہاں سوئے ہوئے تھے۔ یہ تو سارہ کا جلاپا تھا۔ جس سے بچنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو مکہ میں آباد کیا۔ اگر آپ درست کہتے ہیں تو پھر ابراہیمؑ ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کے پاس کیوں جاتے رہے۔ اور تیسری بیوی قطورہ سے کیوں شادی کی۔ اگر آلِ اسحاق کے لئے یہ دستور قابلِ مذمت نہیں تو آلِ اسمٰعیلؑ کے لئے کیوں ہے؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس کتاب مقدس میں تعلیم اور عمل میں اس قدر تضاد ملتا ہے اس کی صحت پر کونسی شہادت ہے۔ کیا تعلیم سچی ہے یا اس تعلیم کے لانے والے نبی سچے ہیں؟ کیونکہ باہمی اختلاف کی بنا پر دونوں سچے نہیں ہو سکتے۔

مکروہ کیوں؟

آپ لکھتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے مطلقہ بیوی کو دوبارہ نکاح میں لانے کا طریقہ بائبل کی رُو سے مکروہ ہے۔" آخر کیوں؟ اگر ایک عورت طلاق لے کر کسی دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے تو پھر پہلے ہی خاوند سے دوبارہ شادی میں کیا

خرابی ہے ؟ ذرا سوچیئے۔ ایک عورت اگر زیادہ خاوندوں سے ہم صحبت ہوتی رہے۔ یہ بہتر ہے یا اس کا پہلے آزماتے ہوئے خاوند سے از سر نو محبت کے تعلقات استوار کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی طلاق غلط فہمی کی بنا پر ہوئی ہو۔ اور دوبارہ یہ ملاپ دائمی رفاقت کا موجب بنے یا ان کی پہلے نکاح سے اولاد ہو۔ جو والدین کی شفقت سے محروم ہو چکی ہو۔ اور والدین کے مل جانے سے بچوں کا مستقبل بہتر ہو جائے۔ جو عورت کی دوبارہ واپسی نہ ہونے کی صورت میں ممکن نہیں۔ شادی محض لذت کشی کا ذریعہ نہیں۔ یہ ایک مجلسی تقاضا ہے۔ جس کا تعلق میاں بیوی، گھریلو سکون، بال بچوں اور خویش و اقارب تک پھیلا ہوا ہے اور اس رشتہ کو دوبارا استوار کرنا مکروہ نہیں۔ بلکہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے مسدود کر دینا خلافِ مصلحت اور مکروہ ہے۔ فصل من مُدکر

قتال اگر موسیٰؑ، داؤدؑ نے منکرین خدا سے جنگ کی تو کیا پیغمبر اسلام نے بھی خدائے واحد اور حق کے دشمنوں سے جنگ نہ لڑی تھی؟

آنحضرتؐ نے قریش مکہ اور قبائل عرب کو توحید کا پیغام دیا۔ انہیں خدا، رسولوں، کتب خداوندی، اعمالِ حسنہ اور قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی وہ آپ کو دکھ دیتے رہے۔ مگر آپؐ نے برداشت کیا۔ حتیٰ کہ تیرہ سال تک مظالم سہنے کے بعد آپؐ اور آپؐ کے نام لیوا ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ تاہم آپ نے دین کے پھیلانے کی خاطر تلوار نہ اٹھائی۔ بلکہ جب مشرکین نے آپ اور مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیئے مدینہ پر چڑھائی کر دی تو آپ نے اپنے بچاؤ کے لیئے ان کا مقابلہ کیا۔ پس یہ جنگیں بھی دین کو پھیلانے کے لیئے نہیں بلکہ دین حق اور مسلمانوں کی جان و مال اور

عزت کی حفاظت کے لئے تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی آپ مشرکین پر غالب آئے تو آپ نے انہیں ہر بار معاف کر دیا۔

اس کے برعکس موسیٰؑ کا بنی اسرائیل کی مدد سے فلسطین پر حملہ بلاجواز تھا۔ آپ بنی اسرائیل کو لے کر وہاں کفر و شرک مٹانے نہ گئے تھے۔ بلکہ وہاں کے اصل باشندوں کو ان کے گھروں سے نکال کر یا انہیں غلام بنا کر ان کے شہروں، زمینوں اور مال و اسباب پر قبضہ کرتے گئے تھے۔ جسے کوئی معقول انسان پسند نہیں کرے گا۔ پس آنحضرتؐ کے ساتھ انبیائے بنی اسرائیل کی جنگوں کا مقابلہ ہی غلط ہے۔

ذرا غور کیجئے۔ بعد کے مسلمانوں کی جنگیں بھی دین پھیلانے کے لئے نہ تھیں مدافعانہ تھیں۔ ایران کی مجوسی اور شام کی غیر ملکی رومی سلطنت نے مسلمانوں کے خلاف طاقت کے غرور میں صف آرائی کی۔ مسلمان قاصدوں کو قتل یا ذلیل کیا۔ آنحضرت صلعم کو گرفتار کرنے کو آدمی بھیجے۔ اور ان کی چھوٹی سی ریاست کو کچلنے کے لئے تیاریاں کیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے اپنے علاقوں کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کو منظم کیا۔ اور اس ٹکر میں دشمن کو شکست ہوئی۔ یہ جنگ ایران کے مجوسی اور روم کے عیسائی مذہب کے خلاف نہ تھی۔ بلکہ قوموں کے خلاف تھی۔ یہی وجہ ہے۔ ان علاقوں میں کسی طبقے کو مذہب کی بنا پر دبایا نہ گیا۔ نہ ان کی عبادت گاہوں کو چھیڑا گیا۔ نہ مذہبی زندگی میں مداخلت کی گئی۔ اور صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی وہاں مسلمان اور عیسائی عرب مل جل کر رہ رہے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے یروشلم کے کلیسائے اعظم میں احتیاط کے

طور پر نماز ادا کرنے سے گریز کیا ۔ غسان کے عرب عیسائیوں کو اسلامی فوج میں شامل کیا ۔ اور اس بنا پر ان کا جزیہ ختم کر دیا ۔ اور اسلامی سلطنت میں عیسائیوں اور یہودیوں کو مناصب عطا کئے ۔ اسلام نے ظلم کرنے والے دشمنوں سے لڑنے کا کیا ہی بلند مقصد بنایا ہے :۔

" ان لوگوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے ۔ جن سے جنگ کی جاتی ہے ۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے ۔ اور وہ اپنے گھروں سے نکالے گئے صرف اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے ۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا ۔ تو یقیناً راہبوں کے حجرے ، گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں " (سورۃ حج) ۔

ماسٹر جی ! کچھ سمجھے ، اللہ کے نام پر ظلم سہتے اور گھروں سے نکالے ہوئے مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے ۔ کہ وہ اپنے لئے نہیں ۔ اللہ کے نام کی سربلندی کے لئے ظالم حملہ آوروں کا مقابلہ کریں اور اللہ کا ذکر قائم رکھنے کے لئے عیسائیوں ، یہودیوں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کریں ۔ ورنہ جہاں تک دین کی اشاعت اور توحید کے منوانے کا تعلق ہے ۔ وہاں لا اکراہ فی الدین اور احسن طریق سے لوگوں کو حق کی طرف

دعوت دینے کا ہی ارشادِ الٰہی ہے۔

اسلام اور لا اکراہ فی الدین

مسیحی بھائیو! ماسٹر صاحب کی دانش مندی کی ایک نئی بات پڑھ لو۔ فرماتے ہیں:۔

"اسلام میں لا اکراہ فی الدین بھی ہے۔ اور دین میں زبردستی ہے۔ جو بر سر عام رمضان میں کھائے یا ہوٹل میں کھائے ان پہ جرمانے کیئے جاتے ہیں۔
جو لوگ محققانہ انداز میں آنحضرتؐ کے حالاتِ زندگی اور سیرتِ رسولؐ کے متعلق سوال کرتا ہے، تو آپ لوگ عوام کو ان کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کرتے ہیں"

ماسٹر جی! لا اکراہ فی الدین کا مفہوم اس قدر ہے کہ:۔ کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرو۔ اور تاریخ شاہد ہے۔ کہ آنحضرتؐ کے مبارک دور میں کسی ایک شخص کو بھی جبراً مسلمان نہ کیا گیا۔ اور صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ:۔

"جو مسلمان اسلام ترک کر کے مکہ چلا جائے گا۔ مشرکین اسے واپس نہیں کریں گے۔
مگر جو مشرک مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس مدینہ آجائے گا مسلمان اسے واپس کر دیں گے"

کیا جبر کے خلاف اس سے بڑی شہادت مل سکتی ہے؟

رہا رمضان میں پابندی، تو کونسی حکومت اپنے دائرہ قانون میں رہنے والے شخص کو ملکی آئین و قانون کی خلاف ورزی کی اجازت دے سکتی ہے۔ کیا لا اکراہ کے ماتحت چوروں زانیوں، ڈاکوؤں، باغیوں، شرابیوں اور جواریوں کو سزا نہیں ملنی چاہیئے۔

پھر رمضان میں مطلق کھانے پینے کی ممانعت نہ تھی۔ صرف کھلے بندوں یا عام ہوٹلوں میں پابندی لگائی گئی تاکہ خدا کے حکم کی علانیہ توہین نہ ہو۔ ورنہ گھروں میں بچوں، بوڑھوں، معذور عورتوں اور بے حیا روزہ خوروں پر کوئی پابندی نہ تھی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آپ گذشتہ دو صدیوں سے اس ملک میں "محققانہ انداز" کی آڑ میں پاکوں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے غالب اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اسے برداشت کیا ہے۔ خود آپ کے زیر نظر مکتوبات میں بھی وہ زہر موجود ہے۔ مگر ہم نے اشتعال کی بجائے معقولیت سے کام لیا ہے اور اب بھی آپ سے کہتے ہیں کہ:۔

مسلمانوں کی بنیادی کتاب قرآن حکیم ہے۔ اس کی رو سے جو اعتراض ہو ہم ہر وقت اس کے جواب کے لئے حاضر ہیں۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ جو اعتراض آپ کی کتاب مقدس پر بھی الٹ کر پڑتا ہو۔ وہ نہ کیجیئے۔ یہ بددیانتی ہے اور حقیقت شناسی کے خلاف، خدا

آپ کو سمجھنے کی توفیق دے۔

آپ کو اس ملک میں آزادی حاصل ہے۔ آپ اپنے مشرکانہ عقائد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ومطہر سیرت پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ قرآن کی پاکیزہ تعلیم کے مفہوم کو بگاڑتے ہیں اور ہر طرح ہزارہا مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے مدعی ہیں۔ اور پھر بھی اس اسلامی مملکت پر جبر کا اتہام لگاتے ہیں۔

ماسٹر جی! خدا کا خوف کرو۔ جھوٹ چھوڑو۔ خدا سے شرماؤ

خلاصہ

ان سطور کی غرض ایک ہی ہے کہ اس تحریر کے پڑھنے والے حق و باطل میں امتیاز کر سکیں

پادری صاحب ہمارے سوالات کے جواب سے مسلسل گریز کر رہے ہیں۔ البتہ انہوں نے قرآن اور آنحضرت صلعم پر اعتراضات کرکے ہمیں اس بات کی وضاحت کا موقع بہم پہنچایا ہے۔ کہ:۔

ان کی کتاب مقدس کیا ہے؟ اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اس کی تعلیمات میں کس قدر تحریف کی گئی ہے اس میں انبیاء کا مقام کس قدر گرایا گیا ہے؟ پھر اس کی تعلیمات اور اس کے ماننے والوں کے عمل میں کتنا فرق ہے؟ اس کی تعلیمات میں انسان کو کیا ادنیٰ مقام دیا گیا ہے؟

اور

پولوس کے زیر اثر عیسائیت نے کتاب مقدس کو کس قدر بدل دیا ہے؟

ہمیں توقع ہے کہ پادری صاحب اسلام پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے کتاب مقدس اور اسرائیلی نبیوں کی سیرت کی صفائی پیش کریں گے ۔ کیونکہ وہ اسلام کے خلاف اپنے ترکش کے تمام تیر چلا چکے ہیں ۔ اور اب وہ "میں نہ مانوں" کی رٹ لگا کر مختلف پیراؤں میں انہی باتوں کو دہراتے رہیں گے ۔

ہم پادری صاحب اور ان کے ہم مشربوں سے پھر پوچھتے ہیں کہ وہ معقولیت سے کام لے کر بتائیں کہ

سوالات

۱ ۔ حضرت مسیحؑ نے کس زبان میں یہودیوں کے سامنے انجیل کی منادی کی ؟

۲ ۔ اگر وہ زبان مسیحؑ اور یہودیوں کی مادری زبان آرامی تھی تو پھر وہ آرامی زبان کی انجیل کہاں ہے ؟ تاکہ دنیا مسیحؑ کے اپنے الفاظ میں ان کے پیغام کو سمجھ سکے ۔

۳ ۔ کیا حضرت مسیحؑ کے گیارہ رسولوں نے حضرت مسیحؑ کے مبارک کلام کو تحریر کر کے محفوظ کیا ۔ اگر کیا تو وہ کہاں ہے ؟

۴ ۔ موجودہ چاروں اناجیل کے مؤلف کون تھے ۔ ان کی سیرت اور تعلیم کیا تھی ؟ اور انہوں نے یہ اناجیل کہاں سے اور کب جمع کیں ؟

۵ ۔ کیا چاروں اناجیل کی تعلیم برحق ہے ؟ اور روح القدس کی تعلیم کردہ ہے ۔ اگر ہے تو پھر ان اناجیل کی تعلیمات میں اختلاف اور تضاد کیوں ہے ؟

۶) اگر انجیل کے لکھنے والے وہ شاگردانِ مسیحؑ نہ تھے جن پر آپ کے عقیدے کے مطابق مسیحؑ کے اٹھ جانے کے دس دن بعد رُوح القدس نازل ہوا۔ تو پھر ان انجیل نولیسوں پر کب روح القدس نازل ہُوا۔ اور اُنہوں نے ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد باتیں کیوں لکھیں؟

۷) اگر چاروں اناجیل میں تضاد ہے تو پھر چاروں میں سے کون سی انجیل سچی اور کون سی جھوٹی ہے؟

۸) پولوس نے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو کیوں بدل ڈالا، کیا وہ مسیحؑ سے مرتبے میں بڑے تھے؟

۹) اگر مسیحؑ سے بڑے نہ تھے تو پھر مسیحی دنیا ان کی تحریفات کو رد کر کے مسیحؑ کی اصل تعلیم کو اختیار کیوں نہیں کرتی؟

۱۰) قطع نظر اس سے کہ مختلف مسیحی فرقوں میں عہد نامہ جدید کی کتابوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کیا وجہ ہے کہ مسیحی کچھ سالوں کے بعد انجیل کے ترجموں میں فرق پیدا کر دیتے یا عبارتوں میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔ کیا اس لئے کہ مسیحی علماء آج تک ابتدائی یونانی انجیل کو کما حقہٗ سمجھ نہیں پائے، یا وہ حالاتِ زمانہ کے مطابق انجیل کی تعلیمات کو بدل کر اسے قابلِ قبول بناتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ جس کی زندہ مثال انجیل کا وہ انگریزی ترجمہ ہے جو New Revised Version (نیو ریوائزڈ ورژن) کے نام سے دس سال پہلے ریاستہائے متحدہ امریکہ سے شائع کیا گیا۔

امید ہے کہ مسیحی دنیا بالخصوص پادری برکت اے خاں صاحب یہ خدمت سرانجام دیں گے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ